

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

کتاب

قیمت ۸

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پانچ گنا وصول کرتا ہے) اور اس کے بعد قیثا یعنی ۸ کے ٹکٹ محصول ہونے پر۔
مینجر ”نگار“

بجائے کتب خانہ

تصانیف نیاز فحشوری

کتاب نگار

نگارستان	جماستان	مکتوبات نیاز	شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور انسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ ہوں حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔	ادنیٰ نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۱۲۰۰ اشعار شامل ہیں۔ ایک درجہ ہیں۔ زبان قدرت بیان و تخیل در پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت پانچ روپیہ (لکھنؤ) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم	ادنیٰ نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان نگینی اور ایسے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیلے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (لکھنؤ) علاوہ محصول	حضرت نیاز کا وہ عظیم انظر انشاء جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (لکھنؤ) علاوہ محصول

اردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد پر عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعرا پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ انتخاب کلام اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات مضامین ادنیٰ نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔ حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت تھار علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعرا کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول پندرہ

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچویں ششماہی تیسری ربع
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھویں ربع یا بارہ شنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
ہر دو اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچویں
کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پانچ گنا وصول
کرتا ہے) اور اس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔
مینجر "نگار"

جلد	فہرست مضامین اپریل ۱۹۴۰ء	شمار
ملاحظات	ادیٹر	۲
ازمیات	ادیٹر	۹
خلیفہ گلزار علی آسیر	تکمیل کاظمی	۱۹
داستان ابرو باد	ادیٹر	۲۸
انقلاب پسندی اور اصلاح عالم	گلاب چاند	۳۳
راجہ بنی	حیات اللہ انصاری	۴۲
اخبار کمپنی کے عہد حکومت میں	سید محمد عبدالعلیم ہاشمی	۵۳
مکتوبات نیاز	ادیٹر	۶۶
باب الاستفسار	ادیٹر	۷۰
کلام ماہر لکھنوی	ع۔ن	۷۳
تنوعات	ادیٹر	۷۹

نگار

اڈیسٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۳	اپریل ۱۹۷۷ء	شمار ۴
-------	-------------	--------

ملاحظات

ہمارے سیاسی اجتماعات !

رام گڑھ میں کانگریس کا جلسہ بھی ختم ہو گیا، لاہور میں مسلم لیگ کا اجتماع بھی منتشر ہو گیا، فارورڈ بلاک کانفرنس بھی اپنی تجویزیں پیش کر چکی — لیکن دنیا جہاں پہلے تھی اب بھی وہیں ہے اور ہندوستان، دورِ تذبذب و بے اعتمادی کی جس منزل سے گزر رہا تھا، ہنوز اسی جگہ ہے —

ایک دفتر تدبیر و مصلحت پیش کیا گیا لیکن ایک ایسا دفتر جو اقدام عمل کی راہوں سے خالی تھا — جرأت و مردانگی کے بڑے بڑے دعوے کئے گئے لیکن اس حال میں کہ دل گرمی سے اور دماغ عقل سے معرّا تھا — آوازیں بلند ہوئیں لیکن ایسے صحرا میں جہاں ان کا سننے والا کوئی نہ تھا !

یہ تھا علی الترتیب ان تینوں سیاسی اجتماعات کا رنگ جن کا ذکر ابھی کیا گیا، لیکن آئیے اس اجمال کی تفصیل پر بھی اک سرسری نگاہ ڈال لیں

مولانا ابوالکلام آزاد نے صدر کانگریس کی حیثیت سے جو خطبہ دیا ہے وہ اپنے سنجیدہ دلچسپی اور اپنے مضبوط دلائل اور اپنے تجزیہ تاریخی کے لحاظ سے یقیناً ایک ایسا پر خلوص لٹریچر ہے

دفتر تدبیر و مصلحت

جسے ہم ایک "دفتر تدبیر و سلسلہ" تو ضرور کہہ سکتے ہیں، لیکن جسوقت ہم اس کے اوراق میں لاکھ عمل کی جستجو کرتے ہیں تو ہمیں سخت ناکامی ہوتی ہے

مولانا آزاد نے جس اختصار و خوبی کے ساتھ ہندوستان کی تحریک آزادی اور برطانوی سامراج پر تبصرہ کرتے ہوئے برطانوی سامراج کو چیلنج دیا ہے اس کے بر محل ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن عملی نقطہ نظر سے مولانا آزاد کا یہ خطبہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟ یہ بہت دلی دکھا دینے والی بات ہے

مولانا، خطبہ کے اختتام پر ملک کو تین ہدایتیں کرتے ہیں۔ ایک اتحاد، دوسرے تنظیم، تیسرے گاندھی جی کی رہبری پر اعتماد کامل! اور چونکہ تینوں باتیں ایک ہی سانس، ایک ہی فقرہ اور ایک ہی سلسلہ میں کہی گئی ہیں، اس لئے یہ تینوں ہدایتیں ملکر ایک ہی ہدایت کی حیثیت رکھتی ہیں اور مولانا اس پر راضی نہیں ہو سکتے کہ ان میں سے ہر ایک ہدایت پر علیحدہ علیحدہ غور کیا جائے۔ اس صورت میں اس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ ملک کا اتحاد اور قوم کی تنظیم بھی بیکار ہے اگر اس مخصوص قیادت کو تسلیم نہ کیا جائے۔ گویا الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جب تک گاندھی جی کے "عصائے موسوی" کے پیچھے پیچھے قدم نہ اٹھایا جائے، ہم "بنی اسرائیل" کی نجات ممکن نہیں!

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ دنیا میں صرف اصول و ضوابط نے کبھی انقلاب پیدا نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ شخصیتوں ہی نے انقلاب پیدا کیا ہے، لیکن تشخص پرستی کی یہ ارتجائی شدت کہ کسی مخصوص فرد کی قیادت پر ایمان لانا ہی اصول کار میں شامل کر لیا جائے، ایسی عجیب و غریب ذہنیت ہے جس کی تائید مولانا ابوالکلام ایسے آزاد انسان کی طرف سے بالکل گوسالہ سامری کا معجزہ نظر آتا ہے اور جس پر جتنی حیرت بھی کی جائے کم ہے!

گاندھی جی کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ان کے خاص و صدراقت پر ایک لمحہ کے لئے بھی شک نہیں کیا جاسکتا لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ عظمتوں کا اور نیتوں کے ساتھ صدراقتوں کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے۔ کل کا بڑا انسان آج چھوٹا ہے اگر اس نے وقت کا ساتھ نہ دیا اور آج کا چھوٹا انسان کل بڑا ہو سکتا ہے اگر وہ زمانہ کی نباضی کر سکتا ہے۔ پھر مجھے اس میں کلام ہے کہ گزشتہ بیس سال کے اندر دنیا اتنی آگے نہیں بڑھ گئی ہے کہ گاندھی جی کی ایک رُبع صدی قبل کی ذہنیت بدستور رہبری کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہو، اور وقت کے تقاضہ کو شخصی اعتماد یا ذاتی اعتقاد کے سامنے یک لخت نظر انداز کر دیا جائے

اول تو گاندھی جی کا، کانگریس سے علیحدہ رہنے کے باوجود کانگریس پر حکمرانی بجائے خود ایسی غیر آئینی بات ہے جس کا جواب نہ گاندھی جی دے سکتے ہیں نہ ارباب کانگریس، لیکن اگر اس بیسویں صدی میں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کسی اجتماع سے علیحدہ رہنے کے بعد بھی اسی اجتماع کا ایک فرد مانا جاسکتا ہے، یا اگر گاندھی جی کی ہستی کو تمام دنیاوی مصالح و تدابیر اور انسانی اصول کار کی سطح سے بلند و برتر سمجھ لیا گیا ہے، تو بھی یہ بات مشکل سے یقین کی جاسکتی ہے کہ اگر آج تک

ساکنان ملاز علی نوع انسانی کے مصائب کو دور نہیں کر سکے، تو اب گاندھی جی کی "فرشتہ خونی" کیونکر ہمارے دکھ درد کا علاج ہو سکتی ہے۔ اگر الہام کا دروازہ بدستور کھلا ہوا ہے تو ہم کو تاریخ نے یہ بھی بتایا ہے کہ الہام محض سے کبھی دنیا کا انتظام نہیں ہو سکا !

گاندھی جی کا حقیقی مفہوم ہندوستان کی آزادی و جنگ آزادی سے کیا ہے۔ اس کا سمجھنا بہت دشوار ہے۔ وہ شخص جو مکمل آزادی سے گھٹ کر مستعمراتی آزادی قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے، جو مستعمراتی آزادی کی طرف سے بھی مایوس ہو کر پھر آزادی کا مل کا مطالبہ کرنے لگے، جو باوجود علمبردار حریت ہونے کے برطانوی دامن کا ہاتھ سے چھوڑنا پسند نہ کرتا ہو، جو باوصف تمام ہندوستان کی نمایندگی کا دعوے کرنے کے مذہبیت کی لعنت میں گرفتار ہو، جسے با اینہمہ ادعائے واداری دوسری قوموں کے جذبات کو صدمہ پہونچانے سے دریغ نہ آتا ہو اور جسکے ملہمات غیبی کا مولد و منشاء صرف چرخہ اور کھڈر ہو۔ اُس سے یہ توقع کرنا کہ وہ ملک کو غلامی کی لعنت سے آزاد کر سکتا ہے، بنجر زمین میں تخم ریزی کرنا ہے اور ہمیں سخت افسوس ہے کہ اس سال کانگریس نے صرف یہی کیا

کانگریس نے تو اپنی جگہ یہ فیصلہ کر دیا کہ گاندھی جی کے ارشاد پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا ہی تنہا ذریعہ نجات ہے، لیکن گاندھی جی فرماتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے لئے پہلے چرخہ اور کھادی کی غلامی لازم ہے اس لئے سوال اب آزادی کا ہے نہ جنگ آزادی کا بلکہ صرف "ننھا کاسنے" کا اور ایک "کچے دھاگے" سے ملک کی قسمت وابستہ کر دینے کا ! اس میں شک نہیں کہ اگر کسی ملک کی تمام آبادی کسی ایک بات پر متفق ہو جائے تو بڑی بات ہے، لیکن یہ بڑی بات کبھی ہوئی ہے نہ ہوگی۔ چھوٹی جماعتیں ہی بڑھکر بڑی ہوئی ہیں اور جن آگروں نے قیصر و کسریٰ کے محلوں کو پھونک کر خاک کر دیا تھا وہ پہلے چنگاریاں ہی تھیں

ہمیں افسوس ہے کہ یہ سال جو حقیقتاً سب سے زیادہ سازگار سال تھا، کانگریس نے بالکل ضائع کر دیا اور نتیجہ کے لحاظ سے اس نے کوئی بات ایسی پیش نہیں کی جسے عملی اہمیت حاصل ہو

ہمیں یقین ہے کہ گاندھی جی پھر برطانوی حکومت سے مصالحت کی کوشش کریں گے اور اگر انہیں کسی غیر یقینی وعدہ کی بناء پر کوئی ملکی سی توقع قائم کرنے کا موقع مل گیا تو وہ یہی مشورہ دیں گے کہ صوبوں میں کانگریسی جماعت پھر عنوان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور پھر وہی لوگ برسر اقتدار آجائیں جن کی آستینوں میں جہاں بھائی خنجر چھپے ہوئے ہیں اور جن کے نزدیک آزادی ہند کا مفہوم، برطانوی اقتدار کے سایہ میں ہندو راج سے زیادہ کچھ نہیں

لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی اپنے اجتماع کے لحاظ سے بہت شاندار رہا اور سفیرانہ مطالبات اس میں بھی کانگریس کی طرح ایک ہی رزولوشن پیش کیا گیا، لیکن فرق یہ ہے کہ کانگریس کے رزولوشن میں عمل کا فقدان تھا اور مسلم لیگ کے رزولوشن میں عمل و عقل دونوں کا، مطالبہ دونوں جگہ

آزادی کا تھا، لیکن وہاں شخصیت پرستی میں تبدیل ہو گیا اور یہاں واہم پرستی میں۔ وہاں چرخہ اُسے کھایا اور یہاں اقلیت کا خوف!

مسلم لیگ کے اس یادگار رزلوشن میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے ایک یہ کہ وفاقی حکومت کے خیال کو بالکل ترک کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ جس وقت آئین جاریہ پر نظر ثانی کی جائے تو یہ سمجھ کر کی جائے کہ مسلمان کبھی اسے قبول نہ کریں گے اگر ان کے مشورہ و منظوری کے بغیر اسے نافذ کیا گیا اور تیسرے یہ کہ صوبہ سرحد، صوبہ پنجاب اور صوبہ بنگال کو (جہاں مسلم اکثریت ہے) علیحدہ علیحدہ آزاد و خود مختار حکومت تسلیم کیا جائے اور دوسرے صوبوں میں مسلم اقلیت کی قومی، مذہبی و اقتصادی حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری لی جائے

اس رزلوشن کا اہمال اتنا کھلا ہوا ہے کہ معمولی دماغ کا انسان بھی اس کو کسی صحیح دماغ انسان کا نتیجہ فکر قرار نہیں دے سکتا۔ اگر بنگال و پنجاب کو علیحدہ علیحدہ خود مختار مسلم حکومت تسلیم کر لیا گیا تو جن صوبوں میں ہندو اکثریت ہے انہیں بھی خود مختار حکومت تسلیم کیا جائے گا اور اس طرح نصف سے زیادہ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ بدستور ہندوؤں کے ہاتھ میں رہیگا۔ تو کیا مسلم لیگ اس مفاہمت پر راضی ہے کہ اگر نصف سے کم مسلمان اپنی جان بچا سکتے ہیں تو باقی نصف سے زیادہ مسلمانوں کو وہ جہنم میں ڈالنے پر راضی ہو جائے گی اور کیا اس مطالبہ کی بناء پر وہ تمام اسلامی ہند کی نمایندہ ہونے کا دعوے کرتی ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کی شرط ہی اس لئے لگائی ہے کہ ہندو صوبوں میں مسلمانوں پر جبر و ظلم نہ ہو سکے تو پھر اس صورت میں خود مختار مسلم حکومتوں کا سوال بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ اس طرح برطانوی اثر و اقتدار بدستور قائم رہے گا اور صورت بدستور وہی رہیگی جو اہمیت پائی جاتی ہے

چودھری خلیق الزماں صاحب نے اس رزلوشن کی تائید کرتے ہوئے جو کچھ کہا وہ رزلوشن سے زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اقلیت کہنا صحیح نہیں۔ وہ ایک قوم ہے اور ایسی قوم جو تلوار سے فیصلہ کرنے سے کبھی نہیں ڈرتی، لیکن مشکل یہ ہے کہ معاملہ کا انحصار رایوں پر ہے، اس لئے اگر کانگریس نے کانگریسی مسلمانوں کی رائے پر عمل کیا تو ”سول وار“ ہو جانا یقینی ہے۔ یہ ہے تقریر اُس شخص کی جو حکومت یو۔ پی کے صدر مقام میں میونسپلٹی کا بڑا قانون داں چیرمین ہے، لیکن وہ یہ سمجھنے سے عاری ہے کہ اس کے اس ایک جملہ میں کتنی متضاد باتیں پائی جاتی ہیں

ایک طرف تو وہ تلوار کے ذریعہ سے فیصلہ کرنے پر طیار نظر آتا ہے اور دوسری طرف سول وار سے بھی ڈرتا ہے تو کیا ”سول وار“ کا تعلق کسی ایسی تلوار سے ہے جس کا بوجھ چودھری صاحب کی نازک کلائی برداشت نہیں کر سکتی۔ یا ”سول وار“ سے مراد صرف گالی گلوچ ہے۔ پھر اگر صورت، وہ ہے تو تلوار کا نام بھی ان کو زبان پر نہ لانا چاہئے اور

اگر صورت دوسری ہے تو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ وہ اس باب میں کانگریسوں سے زیادہ مشاق ہیں اور مسلم لیگ کا پلیٹ فارم سب دھم میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے !

اس میں شک نہیں کہ کانگریس نے متعدد غلطیاں کی ہیں، سب سے پہلی اور بڑی غلطی تو یہ تھی کہ اس نے وزارتوں کے قبول کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسری اتنی ہی نامعقول غلطی یہ تھی کہ وزارتوں پر جہاں بھائی ذہنیت رکھنے والوں کو قابض ہو جانے دیا۔ پہلی غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی ملوکیت پھر ایک ربع صدی کے لئے اپنی جگہ مطمئن ہو گئی اور دوسری غلطی نے مسلمانوں کو کانگریس سے بالکل منفر کر کے مسلم لیگ کے مردہ جسم میں پھر جان ڈال دی

یقیناً مسلمانوں کو اپنے قومی تحفظ کے لئے منظم ہو جانا چاہئے، لیکن اگر یہ تنظیم غیر وطنی جذبات پر قائم ہوتی ہے تو اس سے انتشار ہی بدرجہا بہتر ہے اور میں مسلم لیگ کا صرف اسی لئے مخالف ہوں کہ وہ اپنے آپ کو ہندوستان اور ہندوستانی آبادی سے علیحدہ رکھنا چاہتی ہے اور ہندوؤں کی اکثریت سے ڈر کر وہ ایسے بزدلانہ طریقوں سے کام لینا چاہتی ہے جو مسلمانوں کی روایات تاریخی کے بالکل منافی ہیں

مسلم لیگ کا یہ رزولوشن، یہ الفاظ دیگر گویا قیام ”پاکستان“ کی تحریک ہے، جس میں قومی آزادی کی جدوجہد برطانوی سامراج کے سامنے دست سوال پھیلانے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور اسلام کی تاریخ میں غالباً یہ بالکل پہلا موقع ہے کہ اس نے بھیک مانگنے کا نام آزادی قرار دیا ہو

فارورڈ بلاک کانفرنس میں بھی حقیقتاً ایک ہی رزولوشن پیش کیا گیا جس میں آئندہ معرکہ سے بچت کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اب انتظار کا وقت ختم ہو گیا ہے اور جنگ آزادی کو ۶ اپریل سے شروع ہو جانا چاہئے

اس قرارداد میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ جنگ شروع کرنے کے بعد ہمیں راستہ میں دم نہ لینا چاہئے اور نہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہئے جیسا کہ ۱۹۳۷ء میں ہر حق تحریک شروع کر کے اختیار کیا گیا تھا

میں اس کو صداب صحرا کہتا ہوں کیونکہ ”گاندھی گردی“ میں اس پامردی کو کون پوچھتا ہے جیسا کہ خیال تھا، بہار کے شروع ہوتے ہی فم لینڈ کا قصہ ختم ہو گیا اور روس کو جنگ کے آئندہ امکانات ہندستان کے شمالی، مشرقی و جنوبی علاقہ پر پورا اقتدار حاصل ہو گیا۔ فن لینڈ کی شکست ایک تسلیم شدہ مسئلہ تھا، لیکن اتنی دیر صرف شدت سراکی وجہ سے ہوئی جس نے یہاں کے علاقہ کو روسی افواج کے لئے ناقابل گزر بنا دیا تھا۔ بہر حال وہ توجہ کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب سوال یہ ہے کہ آئندہ نقشہ جنگ کیا ہوگا

اس سے قبل جنگ کے تین محاذ خیال میں آتے تھے، ایک سرزمین بلقان، دوسرے سویڈن و ناروے، تیسرے ہالینڈ و بلجیم اور گمان تھا کہ جہت روس، فنلینڈ کی طرف سے فارغ ہو جائے گا تو ان محاذوں میں سے کوئی ایک محاذ ضرور متعین ہو جائے گا، لیکن یہ خیال غلط نکلا اور جو صبر آزمائے انتظار پہلے تھا وہی اب بھی باقی ہے اور دنیا کی دماغی الجھن و اعصابی کشمکش برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے

اس دوران میں ہٹلر اور مسوولینی کی ملاقات نہایت اہم واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جرمنی کے مقابلہ میں اتحادیوں کی یہ دوسری سیاسی شکست ہے۔ اس سے پہلے دنیا نے سمجھ لیا تھا کہ شاید مسوولینی دہلیز کا اتحاد ختم ہو گیا ہے، لیکن ان دونوں کی آخری ملاقات نے اس کی پوری طرح تردید کر دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ سرزمین بلقان میں جنگ چھڑنے کا بہت کم امکان رہ گیا ہے

جرمنی اور روس کی طرف سے رومانیہ کی آزادی کو قائم رکھنے کے معنی یہی ہیں کہ جرمنی یہاں لڑائی چھیڑ کر اپنے اُس سرمایہ کو تباہ کرنا نہیں چاہتا جو کروڑوں پونڈ کی مقدار میں ریاستہائے بلقان کے اندر پھیلا ہوا ہے اور نہ اپنے اُن تجارتی و صنعتی فوائد کو نقصان پہنچانا مناسب سمجھتا ہے جو بلقان سے صرف امن ہی کی صورت میں حاصل کئے جاسکتے ہیں سوڈن و ناروے کی طرف کسی جنگ کا امکان تو نہیں ہے، لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ جرمنی سوڈن کے بعض ساحلی مقامات کا مطالبہ کرے اور سوڈن بغیر جنگ کے اسے دیدے، کیونکہ وہ پولستان و فنستان کا حشر دیکھ چکا ہے، علاوہ اس کے یوں بھی ہمیشہ سے اس کا رجحان جرمنی کی طرف رہا ہے اور وہاں کی حکومت جرمنی سے اپنے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتی

ہالینڈ و بلجیم البتہ ابھی تک خطرہ میں ہیں اور ہٹلر کئی بار ان پر حملہ کرتے کرتے رہ گیا ہے۔ لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ان پر حملہ کرے گا یا نہیں اور کرے گا تو کب تک۔ لیکن روس کی شرکت نے چونکہ اس جنگ کو مشرق کے لئے بھی ایک حد تک خطرہ سے قریب کر دیا ہے، اس لئے اگر ان خبروں پر اعتماد کیا جائے جو سردایران پر روسی افواج کے اجتماع کے متعلق آئی تھیں، تو ایران کے ساتھ ہی ہندوستان تک اس آگ کی لپٹ کا پہنچ جانا ناممکن نہیں ہے۔ اول تو روس و ایران سے حال ہی میں ایک تجارتی معاہدہ ہو چکا ہے، اس لئے اگر روس نے مشرق کا رخ کیا تو ایران اس کا مزاحم نہ ہوگا اور اگر ہوا تو وہ ایک دن بھی مقابلہ کی تاب نہ لاسکیگا، کیونکہ ایران کی فوجی حالت خراب ہے۔ اور میثاق سعد آباد کی رو سے افغانستان، ترکی و عراق کا اس کی مدد کرنا امید موموں سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ ترکی و عراق و ایران کے باہمی تعلقات اچھے نہیں ہیں اور ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نہ ترکی کا رویہ ایران میں چل سکتا ہے، نہ ایران کا ترکی و عراق میں اور ان کے درمیان آپس میں کوئی تعاون نہیں پایا جاتا

اس میں شک نہیں کہ جرمنی کا ایک مقصود تو اس جنگ سے یہ ہے کہ آرٹلک سے لیکر باسفورس تک اور
رہائیں سے لیکر ولاڈی واسٹک تک پھیلے ہوئے اقتصادی و تجارتی اثرات برطانیہ کے ختم کر دے، دوسرا مقصود
اسی کے ساتھ یہ ہے کہ مشرقِ ادنیٰ میں تمام برطانوی فوجی مستقروں کو تباہ کر دے اور تیسرا مدعا یہ ہے کہ فرانس
کو برطانیہ سے علیحدہ کر کے غیر جانبدار رہنے پر مجبور کر دے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ نے بھی اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لیا
ہے کہ پولستان اور زیکو سلوویکیا کو دوبارہ زندہ کر کے نازی حکومت کے زور کو توڑنا ہے

اس لئے اس جنگ کے جلد ختم ہونے کے آثار نہیں ہیں، کیونکہ باوجود اس عزمِ بلند کے فریقین میں سے کسی
نے اقدام کی جرات نہیں کی ہے اور دونوں اپنی اپنی جگہ گھات میں لگے ہوئے ہیں

برطانیہ کی پالیسی یہ ہے کہ وہ جرمنی کو صرف اپنی ناکہ بندی سے بیدست و پا کر دینا چاہتا ہے اور فوجی
کرنے سے احتراز کرتا ہے۔ فرانس کی پالیسی اس باب میں زیادہ تیز ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اگر جرمنی حملہ نہیں کرتا
تو خود ہی حملہ کر دینا چاہئے، لیکن برطانیہ اس کے لئے آمادہ نہیں۔ دوسری طرف جرمنی کی اقتصادی حالت بھی
ایسی خراب نہیں کہ برطانوی ناکہ بندی اس کو جلد سر جھکا دینے پر مجبور کر سکے۔ اول تو اس کے یہاں خود خام اشیاء
کا ذخیرہ بہت کافی موجود ہے، علاوہ اس کے روس و بلقان کی طرف سے تمام اشیاء کی درآمد بدستور جاری ہے اور
ناکہ بندی کی دسترس سے باہر ہے۔ اب فنتان پر روس کے اقتدار نے جرمنی کے ذرائع کو زیادہ وسیع کر دیا ہے
الغرض اس وقت تک جنگ نے جرمنی کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا بلکہ سچ پوچھئے تو وہ فائدہ ہی میں ہے، برطانیہ کو
اس وقت تک فائدہ کوئی نہیں ہوا اور نہ اس کی کوئی توقع کی جاسکتی ہے، کیونکہ اس کا موقف ہی مدافعانہ ہے۔ البتہ
اگر مشرقِ ادنیٰ میں جنگ شروع ہو گئی یا ہندوستان پر حملہ کا خطرہ پیدا ہوا، تو برطانیہ کو اپنی موجودہ جنگی تدابیر
میں تغیر کرنا پڑے گا اور اس کی تمام وہ بحری، بری و فضائی قوت جو بحرِ اظم، بحرِ روم، اسکندریہ، عدن، خلیج فارس
عراق، فلسطین اور بحرِ ہند میں پھیلی ہوئی ہے حرکت میں آجائے گی کیونکہ ۱۹۳۷ء میں لارڈ لینسٹون دارالامراء
میں مشرق کے متعلق برطانوی پالیسی متعین کر چکے ہیں کہ خلیج فارس یا اس کے آس پاس برطانیہ کسی اور حکومت کا
اقتدار دیکھ ہی نہیں سکتا جس کی تائید ۱۹۳۷ء میں سر ایڈورڈ گرت کی طرف سے بھی ہو چکی ہے

اس دوران میں یہ خبر بھی آئی تھی کہ ہٹلر نے مسولینی سے ملنے کے بعد صلح کی چند شرطیں پیش کی ہیں جن میں پولینڈ اور زیکو سلوویکیا
کو بیس چھپس سال کے اندر آزاد کر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن جرمنی کی طرف سے اسکی تردید ہو چکی ہے اور اگر تردید صحیح ہو تو اس کے
معنی یہ ہیں کہ اتحادیوں غالباً ان شرائط پر صلح کرنے کے لئے طیار ہیں اور انھیں جرمنی سے منسوب کر کے نازی حکومت کا منشاء
معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ خیال صحیح ہے اور واقعی جرمنی نے کسی وقت ان اصول پر صلح کا ارادہ ظاہر کیا تو اتحادیوں اسے منظور
کر لیں گے۔ لیکن ابھی تک یہ تمام باتیں ظن و قیاس کی حدود سے آگے نہیں بڑھیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ جنگ تیقنات اور
تعیینات کی حدود میں کب تک آئے گی۔

ازمیات *Ism s*

(چند سیاسی اصطلاحیں)

پچھلے مہینے ایک صاحب کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے میں نے ایک فہرست ان سیاسی اصطلاحات کی پیش کی تھی جو انگریزی میں ازم (ism) پر ختم ہوتی ہیں اور وعدہ کیا تھا کہ نگار میں ان سب پر روشنی ڈالی جائے گی چونکہ جنگ کی وجہ سے اس وقت بہت سے لوگوں کو سیاسیات کی طرف توجہ ہو گئی ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ بغیر کسی مزید تعویق کے اس سلسلہ کو شروع کر دینا مناسب ہے

ہو سکتا ہے کہ ازمیات کے ختم ہونے کے بعد اور سیاسی اصطلاحات بھی پیش کئے جائیں جن سے ہمیں روز مطالعہ اخبار میں واسطہ پڑتا ہے

فہرست چونکہ پچھلے مہینے دی جا چکی ہے اس لئے اس کو دوبارہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ان اصطلاحوں کو ردیف وار پیش کروں گا، لیکن انگریزی حروف ہجائے کے لحاظ سے اور ہر ممکن اختصار کے ساتھ تاکہ فرہنگ سے بڑھکر یہ علمی تالیف کی صورت نہ اختیار کرے۔ ان اصطلاحوں کا مفہوم زیادہ تر والنٹر تھیمر کے تصریحات کو سامنے رکھ کر متعین کیا گیا ہے

1- Absolutism (استبدادیت) :-

وہ طاق حکومت ہے، جس کے لئے کوئی آئینی یا قانونی حد نہ مقرر ہو۔ اس نظام حکومت میں جمہور کی نمائندگی بالکل نہیں ہوتی، یعنی نہ اُن کی رائے کو دخل ہوتا ہے، نہ وہ نظم و نسق میں کوئی حصہ لے سکتے ہیں سو لہٰذا اس دور میں صدی کی استبدادی حکومتیں، گو مطلق العنان حکومتیں تھیں، لیکن ان کی قوت کا راز امراء و شرفاء کی مدد میں پنہاں تھا۔ اور اگر عوام پر کسی طبقہ یا فرد کی طرف سے کوئی ظلم ہوتا تھا تو ان کی فریاد بھی سنی جاتی تھی اور انصاف بھی ہوتا تھا لیکن اس کے بعد جب جمہور کے جذبات آزادی اور حقوق شاہی کے درمیان تصادم ہوا تو پھر رفتہ رفتہ استبدادیت کا وہ مفہوم قرار پایا جو آج کل آمرانہ حکومتوں میں پایا جاتا ہے، جیسے جرمنی اور اٹلی۔

۲- Activism (عملیت) -

سیاسی جماعتیں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں، ایک وہ جو صرف پروگرام بنایا کرتی ہیں اور عمل کی جرأت نہیں کرتیں، دوسری وہ جن کا مقصد صرف عملی اقدام ہے۔ انہیں لوگوں کا نظریہ عملیت کہلاتا ہے۔

۳- Anarchism (فوضویت)

اس سے مراد کسی حکومت کا نہ ہونا ہے بلکہ صرف ایک ایسی سوسائٹی کا قیام جو قوانین حکومت سے بے نیاز ہو۔ اس نظریہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ حکومت کی ہر قسم (ملوکیت، جمہوریت، جمہوری اشتراکیت) بُری ہے اور ظلم و استبداد کا سبب۔ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا سے قانون، فوج، پولیس، قید خانے وغیرہ سب مٹ جائیں اور سوسائٹی کا نظام صرف آپس کے معاہدوں پر قائم ہو۔ اس نظریہ کے بڑے بڑے علمبردار یہ تھے :-

(۱) ولیم گاڈون (William Godwin) ۱۷۵۶ء - ۱۸۳۶ء -

یہ انگریز تھا اور حکومت و سرمایہ داری کا سخت مخالف تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ بغیر کسی حکومت کے صرف سوسائٹیاں قائم ہو جائیں اور سوائے ضروری ملکیت کے کوئی اور سرمایہ کسی کے پاس نہ رہے۔ یہ کہتا تھا کہ صرف انصاف و اخلاق کی تبلیغ سے ہمیں امن پسند سوسائٹیاں پیدا کرنا چاہئے تاکہ کسی حکومت کی ضرورت دنیا میں باقی نہ رہے۔

(۲) میکس اسٹرنر (Max Stirner) ۱۸۰۶ء - ۱۸۵۶ء -

یہ جرمنی تھا اور معلمی کا پیشہ کرتا تھا۔ یہ فلسفہ خودی کا بڑا زبردست علمبردار تھا، اس نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں خودی و انفرادیت کو سوسائٹی سے زیادہ اہم ثابت کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اخلاق و اخلاقیات پہل چیزیں ہیں اور کسی مقصد کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اچھا ہے یا بُرا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں خود اپنا مقصد ہوں اور میں نہ اچھا ہوں نہ بُرا۔

(۳) پیری جوزف پروڈھن (Pierre Joseph Proudhon) ۱۸۰۹ء - ۱۸۶۵ء -

یہ فرانس کا باشندہ تھا اور مزدوروں کا لیڈر تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی جس کا عنوان ہے ”ملکیت کیا ہے“ اور آخر میں ثابت کیا کہ ”ملکیت چوری ہے“

اس کے بعد اس کی مخالفت صرف بڑے بڑے صاحبان ملکیت تک محدود ہو گئی اور چھوٹی چھوٹی ملکیتوں کی طرف ذرا کرنے لگا۔ دسکے کے رواج اور سود کا سخت مخالف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ضروریات انسانی صرف اشیاء کے باہمی تبادلے سے پوری ہونا چاہئے، جو نیکوں کے ذریعہ سے ممکن العمل ہے۔ آخر عمر میں وہ فوضویت ترک کر کے وفاقی (Federalism) طرز کی حکومت کا قائل ہو گیا۔

(۴) میکائیل باکونن (Michael Bakunin) ۱۸۱۴ء - ۱۸۷۶ء

یہ روس کا نہایت مشہور انقلاب پسند فوضوی (انارکسٹ) تھا اس نے ایک آزاد غیر مرکزی اشتراکیت کو رواج دیا جو کارل مارکس کے نظریہ "حکومت اشتراکی" کے خلاف تھی یعنی کارل مارکس تو یہ کہتا تھا کہ تمام ملکیت حکومت کے سپرد کر دینا چاہئے، لیکن باکونن کہتا تھا کہ چھوٹی چھوٹی مقامی جماعتوں کے سپرد ہونا چاہئے جو باہمی معاہدوں کے ذریعہ سے توازن کو قائم رکھیں، یہ پارلمانی (Parliamentary) طریق حکومت کو غیر مفید بتاتا تھا اور اس کا سر عمل تھا:-

فوضویت - اجتماعیت اور لاندھیت (Anarchism, Collectivism, Atheism)

اس نے اپنے اطالوی، ہسپانوی اور روسی مقلدین کی ایک بین الاقوامی انجمن ۱۸۶۸ء میں قائم کی لیکن متغین مارکس نے اس کی سخت مخالفت کی اور ۱۸۷۲ء میں یہ انجمن ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد بیس سال تک فوضویوں نے بڑا ہنگامہ برپا کیا اور باکونن کے نائب نشانیف (Netchayeff) نے قتل و خون کے ذریعہ سے فوضویت کو پھیلا نا چاہا، چنانچہ روس کا زار اسکندر - اٹلی کا بادشاہ ہمبرٹ (Hamburtt) - فرانس کا صدر کارنٹ (Carnot) - آسٹریا کی ملکہ الزبتھ، اور امریکہ کا پریسیڈنٹ میک کینلی (Mackinley) سب انھیں کے ہاتھوں سے قتل ہوئے

امریکہ میں فوضویت کے علمبردار بنجامن ٹکر (Benjamin Tucker) اور جان موسٹ

(Johann Most) آخر الذکر جرمنی کا اشتراکی تھا۔ امریکہ کے فوضویوں نے ۱۸۸۳ء میں اپنی کانگریس منعقد کی لیکن ۱۸۸۶ء میں اس تحریک کو دبا دیا گیا اور ۱۸۹۱ء سے قانوناً ممنوع قرار دی گئی یہاں تک کہ اب کوئی شخص سرزمین امریکہ میں قدم نہیں رکھ سکتا جب تک وہ یہ اقرار نامہ داخل نہ کرے کہ وہ فوضوی خیال کا نہیں ہے۔

(۵) پٹر کروٹکین (Peter Kropotkin) ۱۸۴۲ء - ۱۹۲۱ء

روس کا ماہر جغرافیہ تھا۔ اس نے "اشتمالی فوضویت" (Communist Anarchism)

کو رواج دیا۔ چونکہ بڑے بڑے صنعتی ادارے فوضویت کے رواج میں حایل تھے اس لئے اس نے سب سے پہلے انھیں کی مخالفت کی اور کہا کہ صنعتی پیداوار چھوٹی چھوٹی صنعت گاہوں کے ذریعہ سے ہونا چاہئے اور ملکیت کو چھوٹے چھوٹے اداروں میں تقسیم کر دینا چاہئے تاکہ وہ اپنے اپنے ممبروں کی ضروریات زندگی فراہم کرنے کے ذمہ دار رہیں وہ تقسیم محنت و عمل کا بھی مخالف تھا اور اجرت کی تعیین کا بھی۔ وہ کہتا تھا کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے لحاظ سے اجرت ملنا چاہئے اور چار بچہ گھنٹے روزانہ سے زیادہ کسی سے کام نہ لینا چاہئے۔

آخر میں یہ بہت اعتدال پسند ہو گیا تھا، چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم میں وہ اتحاد میں کاموافق تھا اور جب سلسلہ میں روس کے اندر انقلاب ہوا تو یہاں آگیا اور کرنسکی (Kerensky) کا طرفدار ہو گیا۔ اس کے بعد جب روس میں اشتیاقیت پسندوں (Communists) کا غلبہ ہوا تو اس نے پروتاری (مزدور پیشہ) لوگوں کے اقتدار کی مخالفت شروع کی اور یہیں سلسلہ تک رہا

(۶) ٹالستانی (Count Leo Tolstoy) ۱۸۲۸ء - ۱۹۱۰ء

یہ مشہور روسی مصنف تھا اور اس کی فوضویت کا رجحان زیادہ تر مذہب کے خلاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حکومت و قانون کا جوڑ مذہب کے ساتھ کوئی مٹی نہیں۔ اور بجائے قانون کے وہ محبت کی حکومت کا قائل تھا۔ وہ امن پسندانہ عدم تعاون کا قائل تھا (جسے بعد کو گاندھی جی نے اختیار کیا)۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ فوجی ملازمت ترک کر دیں، ٹیکس نہ ادا کریں، عدالتوں کو تسلیم نہ کریں تاکہ نظام حکومت از خود ٹوٹ جائے۔

۴۔ Anti-Semitism (ضد سامیت) :- یہودیوں کے خلاف جو تحریک قائم ہو اسے اس نام سے پکارتے ہیں۔ پہلے یہ مخالفت یہودی مذہب سے تھی لیکن اب یہودی قوم سے ہے۔ نازی جرمنی اب اس تحریک کا مرکز ہے۔ اس سے پہلے روس میں بھی یہ تحریک پائی جاتی تھی لیکن سلسلہ کے انقلاب کے بعد سے ختم ہو گئی ہے۔

اس تحریک کا آغاز اٹنیسویں صدی کے وسط سے ہوتا ہے جب آریں یا نارڈک (Aryans) قوموں کی برتری کا نظریہ پیش کیا گیا (جس پر آئندہ دیگر سیاسی اصطلاحات کے سلسلہ میں روشنی ڈالی جائے گی) یہودیوں کے خلاف اس تحریک کا سبب زیادہ تر اقتصادی ہے۔ چونکہ یہودی قوم نے صنعت و حرفت اور تجارت میں غیر معمولی ترقی کر کے ایک بہت بڑی سرمایہ دار جماعت کی حیثیت حاصل کر لی ہے اور سیاسیات پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے، اس لئے یورپ کی بعض یہودی قومیں ان کی مخالفت پر آمادہ ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ جرمنی میں ان کے ساتھ نہایت ظالمانہ برتاؤ کیا جاتا ہے اور ان کو تمام شہری حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے۔

۵۔ Bolshevism (بالشویزم) - کیونترزم کا دوسرا نام ہے۔ سلسلہ میں روس کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی دو جماعتوں میں منقسم ہو گئی تو انتہا پسند جماعت نے جس کا لیڈر لینن تھا کثرت رائے سے اقتدار حاصل کر لیا اور چونکہ اکثریت کو روسی زبان میں بالشنسٹو (Bolsheviks) کہتے ہیں اس لئے اس جماعت کے لوگوں کو بالشیوکی (Bolsheviki) یعنی افراد اکثریت اور دوسری اعتدال پسند جماعت منشیوکی (Mensheviks) یعنی افراد اقلیت کہنے لگے۔

۶۔ Caesarism (قیصریت) - یہ اصطلاح، جو لیس قیصر

(Julius Caesar) کے وقت کی یادگار ہے۔ یہ روم کا مشہور ڈکٹیٹر تھا۔ اس سے مراد فوج یا اہل سیاست میں سے بڑے بڑے لوگوں کی حکومت ہے اور جمہوریت کی ضد۔ اس زمانہ کی ڈکٹیٹری حکومتیں، قیصریت ہی کی قسمیں ہیں۔ Capitalism (راس المالیت) - اس کو سرمایہ داری بھی کہتے ہیں اور متاعیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مراد وہ اقتصادی نظام ہے جس کے تحت دولت کی پیداوار اور تقسیم پرائیویٹ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے لوگوں کو سرمایہ دار کہتے ہیں اور ان کی کاروبار میں لگی ہوئی دولت جس سے بڑا نفع حاصل کرتے ہیں سرمایہ کہلاتی ہے اس کی ضد اشتراکیت (Socialism) ہے جو سرمایہ داری کے نظام کو مٹا کر دولت کو جمہور میں برابر برابر تقسیم کر دینا چاہتی ہے، تاکہ انفرادی فائدہ کے بجائے وہ پبلک مفاد کی صورت اختیار کرے۔

Centralism (مرکزیت) - ایک سیاسی نظام ہے جس کی رو سے تمام سلطنت کا انتظام ایک خاص مرکز سے متعلق ہوتا ہے یہ اس وفاقی حکومت کی ضد ہے، جس میں ملک کے صوبوں کو اختیارات کلی دیدے جاتے ہیں۔

Chauvinism (شاوینیت) - پھولین اول کے ایک نہایت جوشیلے سردار کا نام ساون (Chauvin) تھا یہ اصطلاح اسی کے نام سے نکلی ہے جس سے مراد کسی خاص مقصد یا قومیت پرستی کی انتہائی طرفداری کرنا ہے۔

Clericalism (کلیسائیٹ) - کیتھولک مذہب والوں کی سیاسی تحریک کو اس نام سے منسوب کرتے ہیں۔

Collectivism (اجتماعیت) - ان تمام اقتصادی و سیاسی تحریکوں کا نام ہے جو آپس میں اتحاد عمل اور مرکزیت کے ساتھ کام کریں۔

Communism (اشتمالیت) - اس کی صراحت پچھلے جہینے ہو چکی ہے۔

Fascism (فسطائیت) - اٹلی کی قومی تحریک ہے جس کو ۱۹۱۹ء میں مسولینی نے جاری کیا۔ اس کا اخذ اطالوی لفظ (Fascio) ہے جس کے معنی ہیں لکڑیوں کے گٹھے، قدیم روم میں حاکم اعلیٰ کے آگے آگے لکڑیوں کا گٹھا اور کلہاڑی اظہار شان کے لئے لیکر چلتے تھے۔

فسطائی نظام حکومت، اشتمالیت اور پارلیمانی حکومت کا ضد ہے۔ یہ نہ سرمایہ دارانہ حکومت ہے نہ اشتراکی۔ یہ ذاتی ملکیت کو تسلیم کر لیتی ہے، لیکن اسے حکومت کے اقتدار میں رکھنا چاہتی ہے۔ تجارتی اور صنعتی ادارے سب فسطائی حکومت کے زیر اثر ہیں۔

اٹلی میں اس وقت صرف یہی ایک سیاسی پارٹی ہے جس کے ممبر مسولینی کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ یہ لوگ سیاہ قمیص پہنتے

ہیں اور قدیم اہل رومہ کی طرح اوپر ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہیں۔ فسطائی تنظیم بالکل فوجی تنظیم ہے اور اس کا مقصد قدیم رومہ کی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کرنا ہے۔ یہ جمہوریت کے بھی خلاف ہیں اور لبرل حکومت کے بھی۔ ان کے یہاں ابتدا ہی سے فوجی تعلیم لازم ہے اور ۱۸ سال کی عمر میں ہر نوجوان فسطائی جماعت کا ممبر ہو جاتا ہے۔ یہاں شاہنشاہیت قائم رکھی گئی ہے، لیکن برائے نام۔ تمام انتظامات فسطائی کونسل عظمیٰ کے سپرد ہیں جسے مسولینی نے مقرر کیا ہے۔ اس کونسل کو مسولینی کا جانشین نامزد کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ کیتھولک مذہب کے اقتدار کو یہاں دوبارہ قائم کیا گیا ہے اور ۱۹۳۵ء سے یہودیوں کے خلاف بھی تحریک شروع ہو گئی۔

۱۴۔ *Feudalism* (اقطاعیت)۔ اس سے مراد یورپ کا وہ نظام حکومت ہے جو انقلاب فرانس تک پایا جاتا تھا۔ اس سے مراد جاگیرداروں اور امراء کی حکومت ہے۔ یعنی بادشاہ کے یہاں انھیں لوگوں کا اثر ہوتا تھا اور یہی سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ان کے پاس فوج بھی ہوتی تھی اور حکومت کے مختلف عہدے بھی انھیں کے قبضہ میں ہوتے تھے۔

۱۵۔ *Guild Socialism* (گلد اشتراکیت)۔ گلد قرون وسطیٰ میں اس ٹاؤن ہال کو کہتے تھے جہاں جلسے ہوا کرتے تھے۔ گلد اشتراکیت سے مراد وہ تحریک ہے جو ۱۹۰۶ء میں عہد وسطیٰ کے گلدی نظام حکومت کو موجودہ ترقی یافتہ اصول حکومت کے ساتھ ملانے کے لئے جاری ہوئی تھی، اس سے مقصد یہ تھا کہ حکومت کو مختلف تجارتی جماعتوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر جماعت اپنی جدا کونسل مقرر کرے۔ یہ تحریک اس اشتراکیت کے خلاف تھی جس میں صنعت و حرفت حکومت کے زیر اثر مانی جاتی تھی۔

۱۶۔ *Imperialism* (ملوکیت)۔ جس حد تک برطانوی حکومت کا تعلق ہے، ملوکیت سے مراد برطانیہ کی وہ پالیسی ہے جس کی رو سے مقبوضات برطانیہ کے درمیان تعلقات استوار کر کے ان کو سیاسی حیثیت سے انگلستان کا تابع قرار دیا گیا تھا اور جدید مقبوضات حاصل کر کے سلطنت کو اور وسیع کیا جا رہا تھا۔ ۱۹۱۴ء تک اسی پر عملدرآمد ہوا، لیکن اس کے بعد اس تحریک کو نظر انداز کر دیا گیا۔

زیادہ وسیع معنی میں ملوکیت سے مراد یہ ہے کہ دوسرے ممالک فتح کر کے سلطنتوں کو وسیع کیا جائے۔ موجودہ ملوکیت کی ابتداء انیسویں صدی میں ہوتی ہے اور انھیں مختلف ملوکیت پسند حکومتوں کا تصادم جنگ عظیم کا باعث ہوا، اس ملوکیت میں خصوصیت کے ساتھ انھوں نے زیادہ حصہ لیا، جن کی تجارتی و صنعتی ترقیاں حال ہی میں ہوئی تھیں

(مثلاً جرمنی، اٹلی اور جاپان) اور دوسری بڑی سلطنتوں سے اس لئے خفا تھیں کہ انھوں نے ساری دنیا کو اپنے اندر تقسیم کر رکھا ہے۔ چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جس کے زیر اثر جاپان نے سلسلہ میں چین پر حملہ کیا، اٹلی نے سلسلہ میں حبشہ پر حملہ کیا اور جرمنی نے آسٹریا، زیکو سلوواکیا اور پولینڈ پر قبضہ کر لیا۔

ملوکیت فی الحقیقت وہ سرمایہ دارانہ نظام حکومت ہے جو تجارت و صنعت کی ترقی کے سلسلہ میں مختلف ملکوں کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتا ہے اور دولت کو ایک محدود جماعت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ عوام اور مزدوری ہمیشہ لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ تمدنی حیثیت سے نیچے درجے کے لوگ ترقی کر سکتے ہیں۔ موجودہ آمرانہ حکومتیں بھی، ملوکیت ہی کی مختلف صورتیں ہیں جو جدا جدا ترکیبوں سے سرمایہ دارانہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

۱۷- Isolationism (اجتنابیت) امریکہ کی ایک مخصوص سیاسی جماعت کا یہ نظریہ کہ یورپ کے معاملات سے انھیں کوئی سروکار نہ رکھنا چاہئے۔ موجودہ لڑائی سے پہلے برطانیہ میں بھی کچھ لوگ اس خیال کے پائے جاتے تھے۔

۱۸- Marxism (مارکسیت) اس سے مراد کارل مارکس کے نظریے ہیں۔ کارل مارکس سلسلہ میں جرمن میں بمقام ٹوبین (Tübingen) پیدا ہوا اور ۱۸۸۳ء میں لندن میں مرا۔ یہ یہودی تھا اور تعلیم پانے کے بعد اخبار نویس کی پیشہ کرنے لگا تھا۔ اس کی رائے چونکہ حکومت کو پسند نہ تھیں اس لئے جرمنی سے خارج البلد کر دیا گیا۔ یہ فرانس پہنچا اور یہاں بھی نہ رہنے دیا گیا۔ یہ سلسلہ میں پھر جرمنی آیا، لیکن پھر ناکام رہا اور آخر کار لندن چلا گیا۔ موجودہ اشتراکی و اشتعالی تحریکوں پر مارکس کی تعلیم کا بڑا زبردست اثر ہے۔ اس کے اصول مختصر یہ ہیں کہ دولت کی پیداوار کا ذریعہ صرف مزدوروں کی محنت ہے اور انھیں کو ملنی چاہئے۔ سرمایہ دار کوئی چیز نہیں ہے اس لئے اسے بالکل محروم کر دینا چاہئے۔

مارکس کے نظریہ نے گزشتہ ۶۰ سال کے اندر سیاسیات و اقتصادیات کے ہر شعبہ کو متاثر کیا ہے اور اس کے دشمنوں کو بھی کسی نہ کسی حد تک اس کی تعلیمات پر عمل کرنا پڑا ہے۔

لینن روس کا مشہور انقلابی اسی کے فلسفہ کا پیرو تھا اور روس کی اشتعالیت، مارکسیت ہی کی عملی صورت ہے۔

۱۹- Nazism (نازیت) دوسرا نام بلکہ مخفف ہے National Socialism (قومی اشتراکیت) کا۔ سب سے پہلے سلسلہ میں جرمنی کی لیبر پارٹی نے آسٹریا میں اس تحریک کو شروع کیا تھا۔ لیکن ہٹلر کا براہ راست اس پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہٹلر کی پارٹی کی بنیاد ایک جرمن مزدور ڈکسٹر (Drexler) نے ۱۹۱۹ء میں قائم کی تھی۔ جب ہٹلر اس میں شریک ہوا تو اس کا نام (National Socialist Party) رکھا اور اس کے ۲۵ اصول مقرر کئے جن میں سے خاص خاص یہ ہیں :-

تمام جرمن اقوام کا اتحاد - معاہدہ ورسائی کی تسخیر - حقوق و فرائض میں مساوات - رومن قانون کی جگہ جرمن قانون کا قیام - صحت جسمانی کی ترقی - جبریہ فوجی تعلیم - غیر جرمن اقوام اور یہودیوں کا اخراج - بڑے بڑے تجارتی و صنعتی اداروں پر حکومت کا اثر - کاشت کی اصلاح - عام قومی تعلیم -

لیکن جب ۱۹۳۳ء میں ہٹلر برسرِ اقتدار ہوا تو اس تحریک کا اشتراک کی حصہ تو نظر انداز کر دیا گیا اور اسکی حیثیت صرف قومی تحریک کی سی رہ گئی۔ یہاں سرمایہ داروں کی حکومت تو نہیں ہے، لیکن سرمایہ داری کی ضرور ہے، یعنی ہر چند امراء اور صاحبانِ دولت کا اقتدار حکومت پر نہیں ہے لیکن دولت کی تقسیم بھی ایسی نہیں کہ واقعی اہل احتیاج کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

نازی پارٹی کا نظریہ ہے کہ صرف آریں قوم ہی دنیا میں حکومت کے لئے آئی ہے اور خالص آریں نسل کے لوگ وہی ہیں۔ یہودیوں سے نفرت کا سبب یہ ہے کہ وہ سامی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور جرمنی کا اقتصادی نظام بالکل انکے ہاتھ میں تھا۔

۲۰۔ *Nihilism* (عدمیت) لاطینی لفظ *Nihil* (کچھ نہیں) سے ماخوذ ہے، جسکے معنی "کچھ نہیں" کے ہیں۔ سترھویں صدی میں روس کے اندر بعض لوگوں نے ایک ذہنی نظریہ یہ قائم کیا تھا کہ حکومت یا اقتدار کسی قسم کا بھی ہونا قابل تسلیم ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ آزاد ہے اور اپنے افعال کا مالک - اس تحریک کو ٹرگینیو (*Turgeneff*) کے ناول (*Father & Son*) کی وجہ سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

ہر چند اس تحریک نے انقلابی خیالات پیدا کرنے میں کافی مدد پہنچائی، لیکن یہ بجائے خود کوئی سیاسی تحریک نہ تھی بلکہ صرف فلسفہ اور نظریوں تک محدود تھی۔

۲۱۔ *Pacifism* (امنیت) - دنیا سے جنگ کو ختم کر دینے کی تحریک اس نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ اس قسم کی سوسائٹیاں برطانیہ، امریکہ، جرمنی اور فرانس وغیرہ ہر جگہ قائم کی گئیں اور ہر چند اس کے ممبروں کی تعداد زیادہ نہیں بڑھی لیکن اس کا اثر بیشک دنیا پر بہت پڑا، چنانچہ جنگ عظیم سے پہلے ایک بین الاقوامی صلح پسند کانفرنس کا انعقاد اس کا نتیجہ تھا اور جنگ کے بعد مجلس اقوام کا وجود، بین الاقوامی عدالت گاہ کا قیام اور معاہدہ کلاگ (*Kellogg*) اسی تحریک کا نتیجہ تھے۔ لیکن یہ تمام باتیں صرف معاہدوں اور تحریروں تک محدود رہیں اور عملاً بالکل بیکار ثابت ہوئیں۔

۲۲۔ *Pan Islamism* (ہمہ اسلامیت) - اس سے مراد تمام مسلم اقوام و مسلم حکومتوں کا اتحاد عمل ہے۔ یہ تحریک سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی اور ۱۹۱۹ء میں ایک پان اسلامی کانگریس

۱۹۱۹ء میں امریکہ کے وزیر خارجہ کا نام (*Kellogg*) تھا اس کی تحریک اور فرانسیسی وزیر خارجہ بریاں (*Briand*) کی تائید سے تقریباً دنیا کی تمام قوموں نے ۱۹۲۸ء میں معاہدہ کیا تھا کہ آئندہ بین الاقوامی نزاعات لڑائی سے نہیں بلکہ آپس کے سمجھوتے سے ہونا چاہئے۔ لیکن اس پر عمل کسی نے نہ کیا۔ اس معاہدہ کا نام معاہدہ کیلاگ ہے۔

کے انعقاد کی بھی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن چونکہ سلطان عبدالحمید بہت کمزور انسان تھا اس لئے یہ تحریک کامیاب نہ ہوئی اور جنگ عظیم میں ترکوں کا ساتھ مسلمانوں نے نہیں دیا۔ اس کے بعد جب کمال اتاترک نے خلافت کا وجود ختم کر دیا، تو اس تحریک کا مرکز سرزمین عرب قرار پائی اور خلافت کا مسئلہ طے کرنے کے لئے قاہرہ اور مکہ میں مسلمان جمع ہوئے، لیکن چونکہ ایک سے زائد دعویٰ خلافت پیدا ہو گئے اس لئے کوئی بات طے نہ ہو سکی۔

میتاق سعد آباد کی روسے ایران، افغانستان، ترکی اور عراق میں بیشک معاہدہ اتحاد ہو چکا ہے اسی طرح مصر، عراق اور سعودی عرب میں بھی معاہدہ اتحاد ہوا ہے، لیکن ان کو پان اسلامزم نہیں کہہ سکتے، کیونکہ ان کا تعلق بجائے مذہب کے سیاسیات سے زیادہ ہے۔

۲۳۔ Socialism (اشتراکیت)۔ اس تحریک کا مقصود یہ ہے کہ دنیا کی ملکیت تمام انسانوں میں برابر تقسیم ہونا چاہئے۔ عہد حاضر میں اس کی ابتدا اٹیسویں صدی کے آغاز سے ہوتی ہے، جب سٹامس مور (Sir Thomas Moor) کے خیالی ہیئت اجتماعیہ (Utopia) کو عمل میں لانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے بعد ایک فرانسیسی فوریر (Fourier) (۱۷۸۸ء - ۱۸۴۷ء) نے

سوسائٹی کا ایسا نظام تجویز کیا جس سے طبقات انسانی کفیل بالذات ہو جائیں اور پھر رابرٹ اوڈن (Robert Owen) (۱۷۷۱ء - ۱۸۵۸ء) نے اپنی ساری دولت صرف کر کے نمونہ کے طور پر ایک ایسی فیکٹری اشتراکیت کے اصول پر قائم کی لیکن سوائے اس کے کہ تجارتی اداروں میں اتحاد عمل کا جذبہ تو ضرور اس سے پیدا ہو گیا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اس تحریک کی سیاسی اہمیت ۱۸۴۸ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب پراؤڈھن (Proudhon) نے فرانس میں سکے کا چلن موقوف کرنے کے لئے تبادلۂ اشیاء کے بینک اور اتحاد باہمی کی کمیٹیاں مقرر کرنے اور لوئی بلانش (Louis Blanc) نے ایک قومی دارالصنعت قائم کر کے صنعت و حرفت کو قومی اصول پر رواج دینے کی تجویزیں پیش کیں۔ کارل مارکس اور فریڈرک انجلس (Frederick Engels) ان خیالی باتوں کے مخالف تھے اور اشتراکیت کو عملی حیثیت سے چلانا چاہتے تھے۔

اس وقت جرمنی اشتراکیت کا مرکز بن گیا تھا اور فرڈیننڈ لاسیل (Ferdinand Lassalle) ایک اور اشتراکی جرمن نے سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ مارکس اس کا مخالف تھا اور اشتراکی حکومت کا قیام چاہتا تھا جب ۱۸۶۴ء میں لاسیل (ایک واقعہ محبت میں) قتل ہو گیا تو پھر اس کی پارٹی بھی مارکس کی پارٹی سے مل گئی اور اشتراکیت

۱۹۱۷ء سٹامس مور کی کتاب کا نام ہے جس میں اس نے اپنی خیالی حکومت کو سامنے رکھ کر ایک فرضی جزیرہ کا حال بیان کیا تھا کہ وہاں کی ملکیت کس طرح سب لوگوں میں برابر تقسیم تھی اور وہ کیسی امن و سکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ کتاب پہلے لاطینی میں شائع ہوئی (۱۵۱۷ء) اور پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی کیا گیا۔

کا اتنا زور ہوا کہ برطانیہ، فرانس، آسٹریا اور روس ہر جگہ یہ تحریک پھیل گئی۔

۱۸۶۵ء میں مارکس نے ایک بین الاقوامی انجمن مزدوروں کی قائم کی جسے اصطلاح میں پہلی انٹرنیشنل (First International) کہتے ہیں۔ اس کے بعد اشتراکیت اور فوضویت میں تصادم ہوتا رہا اور دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی مخالفت کرتی رہیں، تاہم اشتراکیت کی تحریک برابر جاری رہی اور مارکس کے انتقال (۱۸۸۳ء) کے بعد بھی لوگ اسے چلاتے رہے۔

۱۸۸۹ء میں انٹرنیشنل کی پھر تجدید ہوئی اور تمام دنیا کی اشتراکی جماعتیں اس میں شریک ہو گئیں۔ اس کو دوسری انٹرنیشنل کہتے ہیں۔ اسی دوران میں ایک اصلاحی جماعت اور پیدا ہو گئی جو اصول اشتراکیت کی تو قایل تھی لیکن تدریج کے ساتھ منزل مقصد تک پہنچنا چاہتی تھی اور مارکس کی تعلیم یہ تھی کہ ہنگامہ کر کے فوراً انقلاب پیدا کرنا چاہئے۔ ۱۹۱۲ء میں انٹرنیشنل نے جنگ کے خلاف تجویز پاس کر کے سرمایہ داروں کو ڈرایا کہ اگر انھوں نے جنگ میں حصہ لیا تو وہ بفاوت کر دیں گے، لیکن جب ۱۹۱۴ء میں لڑائی شروع ہوئی تو اکثر اشتراکی اپنی اپنی حکومتوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہو گئے۔ تاہم انتہا پسند اشتراکیوں کی ایک جماعت ایسی موجود تھی جو اپنے خیال پر قائم تھی اور آخر کار اسی نے لینن کی قیادت میں ۱۹۱۷ء میں روس کے اندر انقلاب پیدا کیا اور خود جرمنی میں بھی اسی تحریک نے لڑائی کو ختم کر دینے میں بڑا حصہ لیا، کیونکہ جرمنی کی قیصریت و ملوکیت کو اشتراکی تحریک ختم کر چکی تھی اور ملک جنگ کے لئے آمادہ نہ تھا۔ اس انقلاب کے بعد جرمنی میں تو اعتدال پسند اشتراکیوں کا غلبہ ہوا، لیکن روس میں انتہا پسندی کا وہ زور ہوا کہ اشتراکیت کمیونزم بن گئی۔

برطانیہ میں اشتراکیت کی نمایندگی ایک حد تک لیبر پارٹی کر رہی ہے، لیکن کمیونزم کا وہاں پتہ نہیں۔ جرمنی میں البتہ اشتراکی ووٹوں کی تعداد ہٹلر کے سامنے ۳۸ فی صدی تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت صرف روس ہی ایک ایسی سلطنت ہے جہاں انتہا پسند اشتراکیت کی حکومت ہے اور اب میکزیکو (Mexico) میں بھی قائم ہو گئی ہے، ورنہ دوسری سلطنتوں میں اس وقت تک اس کا رواج نہیں ہوا ہے۔

۲۴۔ Syndicalism (صنعی اشتراکیت)۔ یہ مزدور طبقہ کی انقلابی تحریک ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تجارتی و صنعتی اداروں کی تنظیم مزدوروں اور کام کرنے والوں کے مطالبات و اغراض کو سامنے رکھ کر کی جائے۔ ان کا خاص حربہ ہڑتال (Strike) ہے۔ جنگ کے بعد یہ تحریک اشتراکیت کا جزو بن گئی ہے۔

۲۵۔ Zionism (صیہونیت)۔ یہ یہودیوں کی تحریک ہے جس کا مقصد فلسطین میں یہودی حکومت قائم کرنا ہے۔ اس کی ابتداء ۱۸۹۵ء میں ہوئی اور سب سے پہلی اسکی کانگریس کا جلسہ ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ ڈاکٹر ہرنزل (Dr. Herzl) اس کا بانی ہے اور اس وقت ۲۰ لاکھ یہودی اسکے ممبر ہیں۔

خلیفہ گلزار علی اسیر

خلیفہ گلزار علی اسیر میاں نظیر کے فرزند اکبر تھے مولف زندگانی بے نظیر کا بیان ہے کہ سال ۱۲۲۷ھ میں پیدا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میاں نظیر ہی کے مکتب میں تعلیم و تربیت پائی تھی اور باپ سے شاعری بھی ورثہ میں ملی تھی، میاں نظیر کی زندگی تک گچھرے اڑاتے رہے سال ۱۲۴۷ھ میں نظیر نے انتقال کیا تو اسیر (تیس سال کی عمر میں) تہاراجہ بلونت سنگھ کاشی والا، اور مائی تھان والوں کو پڑھانے لگے، دو جگہ کی آمدنی ستر روپیہ ماہوار تھی، گوالیار میں ان کے دو گھوڑے بھی تھے وہاں سے فی گھوڑا بائیس روپے آتے تھے جس میں سے بارہ وہیں کٹ جاتے اور بتیس روپے خلیفہ جی کو ملتے تھے۔ اس طرح سو روپیہ ماہوار سے زیادہ آمدنی تھی، میاں نظیر کی سی غربت اور بخل منساہرہ ان کی طبیعت میں نہ تھی۔ مولف زندگانی بے نظیر کسی نوازش علی بیگ کی زبانی روایت کرتے ہیں کہ سال ۱۲۴۷ھ میں تہاراجہ بلونت سنگھ نے آگرے میں ایک مشاعرے کی بنا ڈالی اور بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ ہونے لگا چونکہ خلیفہ جی تہاراجہ کے نوکر تھے اس لئے تہاراجہ نے ان سے خواہش کی کہ مشاعرہ کے لئے غزل کہہ دیا کریں۔ انھوں نے کہا میں اس لئے نوکر نہیں کہ اپنی غزل تمہیں بخشا کروں تم خود کچھ کہو جہاں کہیں خامی یا نشیب و فراز ہوگا، درست کر دوں گا، تہاراجہ نے مجبور ہو کر حاتم علی قہر کو بلوایا اور وہی غزل کہہ دینے لگے، مگر ان کے اس تیکھے پن کے باوجود تہاراجہ انھیں بھی مشاعرہ میں بلواتے اور اپنا استاد سمجھتے، مشاعرہ میں خلیفہ جی کو اپنی دہنی طرف بٹھاتے اور قہر کو بائیں طرف، دونوں کے آگے چاندی کا حقہ لگایا جاتا، مرزا حاتم علی قہر تو حقہ پر اکتفا کرتے مگر خلیفہ افیون کے رسیا اور بھنگ کے دلدادہ تھے حقہ سے بھلا کیا سیر ہوتے، ساقن جو دوسروں کو حقہ پلانے مقرر ہوتی اس کو بلاتے اور گرما گرم حقہ سے محفل مشاعرہ کو دھواں دھار بناتے تھے، قہر ذرا مہذب آدمی تھے پہلی دفعہ انھوں نے خلیفہ جی کی یہ حرکت دیکھی تو کچھ حیرت کا اظہار کیا خلیفہ جی کب چونکنے والے تھے فوراً یہ مطلع سنایا:

دل میں الفت ہے جو اک سانولی متوالی کی گو مسلمان ہوں پہ بول اٹھتا ہوں بے کالی کی

خلیفہ کی تعلیم بھی نہایت معمولی ہوئی تھی میاں نظیر کی ولایت کے ثبوت میں مولف زندگانی بے نظیر نے ایک روایت نوازش علی کے حوالے سے بیان کی ہے کہ جب کبھی میاں نظیر خلیفہ جی کو ساتھ لے کر مکتب کی طرف روانہ ہوتے خلیفہ جی پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے مکان کو واپس ہو جاتے، میاں نظیر پر نالج کا حملہ ہوا اور تین روز کی بیہوشی کے بعد چوتھے روز ہوش آیا

توانہوں نے دریافت کیا کہ مکتب کون پڑھا رہا ہے اس کے جواب میں خلیفہ جی نے کہا آپ کے سوا بھلا کون پڑھا سکتا ہے میں نے تو ابھی تک گلستاں بھی ختم نہیں کی ہے مکتب کے طلباء، طغرا اور ابوالفضل پڑھتے ہیں بھلا میں انہیں کیا پڑھا سکتا تھا اس لئے کوئی انتظام نہ ہو سکا، میاں نظیر نے کہا تم جاؤ بھی تو، چنانچہ خلیفہ کا بیان ہے کہ ”ارشاد سے ان کے گیا اور اُن کی دعا سے کچھ ایسا بہرہ کہلا کہ پھر کوئی کتاب مشکل ہی معلوم نہ دی حقیقتاً یہ بھی اُن کا ایک تصرف تھا“ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ بس یوں ہی خلیفہ بن گئے تھے پڑھے لکھے اسی قدر تھے کہ گلستاں تک نہیں ختم کی تھی۔

مولف زندگانی بے نظیر کا بیان ہے کہ خلیفہ کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی اور شاگردوں کا جم غفیر ہمیشہ لگے ساتھ رہتا تھا، شہباز نے خلیفہ جی کے دو دوا دین کا تذکرہ کیا ہے ایک مطبوعہ اور دوسرا قلمی لالہ سریرام نے خجائے جاوید میں ان کی ایک مثنوی کا ذکر کیا ہے جو سوز عشق کے نام سے مشہور تھی۔

خلیفہ جی نے ۱۲۹۵ھ میں انتقال کیا ان کے ایک شاگرد غلام محمد خاں ربانے تاریخ وفات لکھی جو لوح مزار پر کندہ ہے

گفت اسیر دام ہستی شد رہا

اس میں چھ عدد کا تخرجہ ہے۔

یہ حالات تھے خلیفہ جی کے جو پروفیسر شہباز کی کتاب زندگانی بے نظیر سے ملے، آئیے اب ہم اسیر کا مطالعہ ان کے کلام کی روشنی میں کریں۔ ہمارے پیش نظر اسیر کا دیوان مطبوعہ مطبع حیدری واقع دارالخلافہ اکبر آباد کٹرہ حاجی محمد حسن باہ شعبان المعظم ۱۲۷۶ھ مطابق فروری ۱۸۶۲ء ہے جو رائل سائز اور (۱۲) سطری مسطر پر طبع ہوا ہے متن میں ۱۳ اور حاشیہ پر ۱۴ اس طرح فی صفحہ ۲۷ شعر ہیں ۱۶۰ صفحات ہیں بظاہر اس دیوان میں (۴۷۵۲) شعر ہیں، آخر میں دو ایک نمبر ایک آدھ مسدس چند رباعیاں ہیں مگر سب معمولی شروع سے ۱۶۹ صفحات تک غزلیات ہیں عموماً غزلیں بڑی بڑی ہیں اور دو غزلہ سے غزلہ کہتے گئے ہیں جس سے ان کی پرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔

دیوان پیش نظر خلیفہ جی کی زندگی ہی میں طبع ہوا ہے اس دیوان کی طباعت کے انیس سال کے بعد خلیفہ جی نے انتقال کیا ہے انیس سالہ شاعری جس دیوان میں تھی وہ پروفیسر شہباز کی نظر سے گزر چکا ہے مگر افسوس ہے کہ انہوں نے کوئی اچھا انتخاب اس دیوان سے نہیں کیا صرف چند شعر اسیر کے نقل کئے ہیں جن میں سے اکثر اس مطبوعہ دیوان میں ہیں۔ بقیہ چار چھ شعر ایسے ہیں جو اس دیوان میں نہیں مگر وہ شعر بھی کوئی خاص بات نہیں رکھتے، مثنوی جس کا ذکر سریرام صاحب نے کیا ہے ہمیں نہ مل سکی اور نہ پروفیسر شہباز ہی کو اس کا پتہ چلا اور نہ وہ ضرور مثنوی کا تذکرہ کرتے۔ اس دیوان کے مطالعہ سے ذاتی حالات بہت کم معلوم ہوتے ہیں ان کی مفلسی پر روشنی پڑتی ہے اور ناقدری کا پتہ چلتا ہے، حب اہل بیت اور مذہبی توغل بھی ظاہر ہوتا ہے اور ساتھ شاعرانہ ذوق نگاہی بھی نظر آتی ہے باوجود اس کے کہ سورہ پیہ ماہوار خلیفہ جی کی آمدنی تھی اور اس زمانہ میں سورہ پیہ خاصی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ بڑے بڑے

شاعر میں روپیہ ماہوار پر زندگی بسر کر رہے تھے ملک الشعراء استاد ذوق پانچ روپیہ ماہوار پاتے تھے ان کے مقابل میں تو اسیر کی آمدنی بہت زیادہ تھی مگر متعلقین کی زیادتی کے علاوہ افیون نوشی اور اس کے لوازمات کی کثرت کی وجہ سے شاید یہ آمدنی ان کو کفاف نہیں کرتی تھی اسی وجہ سے مفلسی کا رونا روتے رہے اس سبک وضعی کا احساس انکو بھی تھا چنانچہ کہتے ہیں :-

یہ سچ ہے نسب میں ہوں گراں قدر اسیر آہ
لیکن میں سبک وضعی سے مطمئن جہاں ہوں
اس کے ساتھ ہی ساتھ جادو پردی سے انحراف کا بھی انھیں افسوس تھا۔

افتادگی کی چال چلو تم بھی اب اسیر!
انھیں وجہ سے فراغت نصیب نہ تھی اور روتے تھے کہ
وضع پدر جو چھوڑے وہ فرزند کچھ نہیں

سر میں بھی اٹھاؤں جو ترے دور میں اسے چرخ
مفلسانیم و ہوائے مسی و مطرب داریم
افلاس میں ہو سیر تو دل سیر ہو کیا خاک
اے لذت دنیا تجھے کیا یاد کریں گے
تس پر بھی نہ پیچھا کبھی افلاس نے چھوڑا
افلاس کا غلبہ ہوتا تو یہ کہہ کر تسکین دے لیا کرتے تھے کہ
مولیٰ کی اک نظر ہے فقط کیمیا اسیر
مگر باد جو اس مفلسی کے گلچھرے اڑاتے تھے

کچھ غم نہیں جو آیا ہے افلاس اب کے پھر
جانبے کیا کرتا ترے پاس اگر زر ہوتا،
مفلسی میں تو یہ گلچھرے اڑاتا ہے اسیر

مفلسی میں انسان متمولوں سے متنفر ہو جاتا ہے اور یہ جذبہ اس قدر شدت اختیار کر لیتا ہے کہ وہ کسی متمول کی صورت
بھی دیکھنا نہیں چاہتا،

ہو جو مقدور تو دنیا میں منادی کر دوں
سا منے ہو کے نہ مفلس کے تو نگر نکلے
باوجود اس مفلسی کے خود داری اور غیرت کا یہ حال تھا کہ نود و دلتوں کی خوشامد یا مصاحبت کرنا پسند نہ کرتے تھے۔

سوداغ مفلسی مجھے دل پر قبول ہیں،
لیکن نہیں ہے صحبت نود و دلتاں پسند
اسی مفلسی نے انھیں اپنی بختی کا احساس بھی پیدا کر دیا تھا اور اپنے تئیں بڑا بلیس و بے بس تصور کرتے تھے۔

ہم کو ان کانوں نے جو جو کہ سنایا وہ سنا
ہم کو ان آنکھوں نے جو جو کہ دکھایا دیکھا
پٹکا جو فلک نے تو زمیں نے دیا سر کا،
میں اک گل بازی ہوں ادھر کا نہ ادھر کا

اسی سلسلہ میں یاران وطن سے بھی شکایت پیدا ہو گئی تھی،

طوق پہنائیں گے یاران وطن گردن تک
اک داغ ہے ہم صحبتی اہل وطن کا

بیڑیاں کاٹ جو صحرا کو نہ بھاگے گا اسیر

یاں شمع کہاں ہے مرے دیرانے میں مجنوں

اس کے باوجود اپنی پاک باطنی اور صاف دلی پر ناز تھا،

گنج لیجاتی ہے دنیا مرے دیرانے سے

باطن آباد ہے ظاہر میں خرابی ہے اگر

شاعری سے متعلق نہ صرف خلیفہ جی کے فنی معلومات ہی اچھے تھے بلکہ شرف نگاہی بھی ان میں پیدا ہو گئی تھی، دوستوں کی تعریف کو وہ حقیقی تعریف نہیں سمجھتے تھے بلکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ لوگ منہ دیکھے کی کہتے ہیں۔

کہتے ہیں یہ جو تیرے سب دوستدار اچھا

نازاں نہ ہو اسیر اب کچھ اپنے شعر پر تو

دشمن کے منہ سے نکلے بے اختیار اچھا

پر ہم تو اس کو اچھا کہتے ہیں جس کو سنکر

شاعری میں بعید مضامین اور گتھیاں سلجھانے کے بھی وہ قابل نہ تھے صاف اور سیدھے شعر چاہتے تھے۔

معنی شعر جبکہ بدقت سمجھ میں آئے

تو شعر کا ہے کو وہ ہوا چیتاں ہوا

لوگوں کے مضامین لے کر اپنے رنگ میں بانڈھنے کے بھی وہ قابل نہ تھے بلکہ اُسے برا سمجھتے تھے

نکلی ہوئی کہیں نہ کسی کے دہن کی بات

ہے اپنے قاعدے میں یہ شعر و سخن کی بات

انھیں اس کا احساس تھا کہ بڑے سے بڑے استاد کی بھی پوری غزل مرصع نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی دو شعر ہر غزل میں اچھے نکلتے ہیں

اچھے ہیں اس غزل میں بھی اشعار ایک دو

کیوں اہل معنی داد سخن دیں نہ اسے اسیر

معلوم ہوتا ہے کہ آغاز مشق میں ان پر اعتراض بہت ہوتے تھے کبھی تو ارد ہو جاتا تو لوگ سرقہ بتاتے تھے اور اگر غزل اچھی ہوتی تو کہتے کہ استاد سے کہلو الیا ہے غالباً یہ باتیں نظیر کے انتقال سے پہلے کی ہیں اور یہ شعر بھی جب ہی کہے گئے ہیں۔

اس کو بس غیر کا مضمون بتاتا ہے کوئی

سخت مشکل ہے اگر ہو دے تو ارد واقع

تہمت استاد کے شعروں کی لگاتا ہے کوئی

اور لکھتے ہیں جو ہم شستہ و رفته سی غزل

کیوں نہیں طبع سے پھر طبع لڑاتا ہے کوئی

اس کے بعد چیلنج کرتے ہیں

ہم چراتے ہیں غزل ایک چراتا ہے کوئی

شک ہو کر دل میں تو کر مصرعہ رنگیں موزوں

آج مرزا بھی ہیں منصف ابھی کھلجائے گا

غالباً مرزا سے مراد مرزا حاتم علی قہر ہے، کیوں کہ ایک اور شعر میں انھوں نے اپنے چند معاصرین کو گناہا ہے جن کے

منجملہ تہریری ہیں۔

تہر و مہ اعظم و آغا ہیں سخن سنج اس سیر
گرا نصیب عیب جوئی اور خوردہ گیری کی عادت نہ تھی۔

عیب جو یاں سخن ڈھونڈتے ہیں عیب آسیر
دلا تو عیب چھپا اور ہنر کو دیکھ سا کر

شاعری چمکے جو چندے یہی صحبت رہ جائے

جو ہنرمند ہیں وہ داد ہنر دیتے ہیں،
عدو کی چشم جو سوئے ہنر نہیں تو نہ ہو

معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں آگرہ میں شاعری کا زور شور تھا اور ہر شاعر طوطی ہند بنا ہوا تھا، دیکھئے طنز کرتے ہیں
اور کتنا گہرا طنز ہے

جس کو سنئے وہ جواب بلبل شیراز ہے
مگر اپنے کلام کی حقیقی قدر بھی آپ جانتے تھے اور آگرہ والوں کی ناقدری کے شاکی بھی تھے۔

گاہک ہی آگرہ میں سخن کا نہیں اسیر
آج شاخ قلم خشک سے جز تیرے اسیر

چپ رہنے کو تصویر ہوں برسوں بھی نہ بولوں
آسیر سخن سنج کی کچھ نہ پوچھو

آپ کو یہ زعم بھی تھا کہ مرنے کے بعد آپ کی رنگینی طبع سے گل احمر کھلیں گے، یہ مضمون تعلی میں بالکل نیا ہے :-
کیا کیا گل احمر مری مٹی سے کھلیں گے

مگر یہ سب جوانی کی باتیں تھیں جب بڑھا پا آگیا تو طبیعت بیٹھ گئی
پیری میں کہاں رونق ایام جوانی،

برجستہ شعر، بندش مضمون کہاں اسیر
وہ گرجی مضمون تو ہوئی سرد اسیراب،

والد کے دیوان کی فکر بھی رہی ہے ممکن ہے کہ نو لکھنور کا پہلا ایڈیشن جو بہت ضخیم تھا جس میں ہزلیات کا بھی
خاص حصہ تھا خلیفہ صاحب ہی کا مرتبہ ہو

گر چاہو کہ ہوں صاحب دیوان آسیر آپ
معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں بالکل میاں نظیر کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور باد و ستاں تلافی باد و ستاں مدارا پر عمل کرتے تھے۔

میں وہ ہوں دوست کہ دشمن کو بھی ناخوش نہ کروں
نظیر کی طرح خلیفہ آسیر نے "مقامیات" پر کوئی مستقل نظم یا غزل نہیں کہی ہے مگر بعض شعر مقامی رنگ کے ضرور کہے ہیں

شیرازہ دیوان پدر کھینچ کے بانڈھو
کچھ بجز لطف و مدارات مجھے یاد نہیں

دیکھو تو آگرہ میں دیوالی کی روشنی
اب جنوں چل کسی ویرانے میں سر پھوڑیں گے
وہ رنگ زرد مرادیکھ ہنس کے کہتے ہیں،
کسی نے کہا ہے:- ”دیوانہ باش تاغم تو دیگران خورند“۔ مگر اس سے اچھی چیز نیم پاگل پن ہے جسے اردو میں اُکو،
گدھا وغیرہ کہتے ہیں اس کو ذرا پھکڑ قسم کے لوگ ”چوتیا پن“ کہتے ہیں اس قسم کی مخلوق دنیا میں بڑے بڑے منزے میں
رہتی ہے خلیفہ جی نے اسی کو بے شعوری سے تعبیر کیا ہے:-

جو بے شعور ہیں دنیا میں چین سے ہیں اسیر
عاشقانہ شعر خلیفہ جی نے خوب کہے ہیں بعض شعر نزاکت تخیل کی بڑی اچھی مثال ہیں:
آیا جو چلتے چلتے تری زلف کا خیال
دیکھئے کس قدر لطیف شعر ہے:

یاد آتی ہیں کسی کی غضب مہربانیاں
اس شعر میں ایک سوز ہے جس کی جھلکیاں کہیں کہیں ملتی ہیں:
جب سے پڑا دل عشق میں تب سے قصہ خوانی بھول گیا
اپنی کہانی یاد رہی اور سب کی کہانی بھول گیا
اسی غزل کے دو شعر اور سن لیجئے:-

جان پھنسی ہو آفت میں تے جیتے ہیں نے مرتے ہیں
ہائے رے اس نیاں کا براہورہ رہ کر چکپاتا ہوں
شعر ملاحظہ ہو بعض لوگ اس کو تصوف کے رنگ میں سمجھیں گے، مگر یہ عاشقانہ شعر ہے، خوب کہا ہے:-
میرے دو آنکھیں اس کے لاکھ جلوے
کس قدر صحیح کہا ہے۔

جس کی گردن میں لپٹی ہے سکھا دیتی ہے
چند شعر مختلف مضامین کے سنئے:-
سیتے میں مرے آہ تو مدت سے ہوئی سرد

سہ شاید انیس کی رباعی اسی سے ماخوذ ہے:-

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں،
ہر جاتری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں،
حیران ہوں دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

جے جو دل تو ہو آہ شہرِ فشاں پیدا
 شاید کہ ساتھ نالہ کے جاں ہو گئی رواں
 پھر کسی کا ہاتھ سے کھینچا ہے دامنِ غیر نے
 پھر کسی نے رخ پہ اپنے چھوڑ دی زلفِ سیاہ
 حیف میں دیکھوں اور دل جائے
 ظلم بتاں ہوا ستمِ آسماں ہوا
 مرا فسانہ ہوا گوشش زدِ خلائیق کے
 دل ترا سینہ ترا سر ترا سماں تیرا
 کب کے لے اڑتی زمیں سے مجھے ساتی یہ شراب
 میری وحشت نے رفوگر کو بھی حیراں کر دیا
 سنئے اسے کان لگا کر ذرا
 اپنے میں پاؤں کی زنجیر ہلا دیتا ہوں
 بزمِ اغیار میں بیٹھا ہوا تو یاد آیا
 مجھے خبر نہیں دامن تھا یا گریباں تھا
 دل پہ اللہ اختیار نہیں
 عجب کچھ تفرقے سے شہرِ آب و گل میں پھرتا ہوں
 بے دل کے جے سوزِ جگر میں نہیں ہوتا
 میخواری سے تو بہے پر اس وقت ہوں محذور
 بخت جاگا کیا جب تک کہ رہے ہم سوتے
 کچھ جامہ زیبیاں تو گل انداموں پر ہیں ختم
 اگرہ پریشہ دلی کا اثر رہا ہے مگر خلیفہ جی کے کلام میں لکھنؤ کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے چند شعر ملاحظہ کیجئے:-
 ستم سچ دھج بنا تھا بلا چوٹی گندھانا تھا
 تیری آنکھیں پھرتے ہی عالم کی آنکھیں پھر گئیں
 چہرہ خورشید درخشاں سے ہے تاباں تیرا
 رہتا ہے خزاں میں بھی ہر از خم بدن کا
 لگے نہ آگ تو کس طرح ہو دھواں پیدا
 مرغِ چمن جو کھول کے منقار گر پڑا
 پھر کسی کا چاک تا دامن گریباں ہو چلا
 پھر کسی سودا زدہ کا دل پریشاں ہو چلا
 میری آنکھوں کے سامنے مارا
 یک مشت استخوان پہ کیا کیا یہاں ہوا
 ہزار حیف تمھارے نہ کان تک پہونچا
 پاس عاشق کے جو ہے سب ہے مری جاں تیرا
 کوئی معشوق بغل میں جو بہو کا ہوتا
 جب تلک دامن سیا ٹکڑے گریباں کر دیا
 قصہ دل ہے یہ کہانی نہیں
 جبکہ حلقہ در زنداں کا ہلاتا ہے کوئی
 گرد گل کے نظر آئے جو چمن میں کانٹے
 کئے ہیں رات کو کچھ تار تار سے میں نے
 ہو نہ مجبور اس قدر کوئی
 مجھے ڈھونڈھے ہے دل میں جستجوئے بلبلیں پھرتا ہوں
 خوشبو کے لئے آگ پہ رکھتے ہیں اگر کو
 جب شلخ پہ گل صورت پیمانہ بنے گا
 ہم جو بیدار ہوئے بخت کو سوتے دیکھا
 جس رنگ کی پہناؤ بدن میں قبا کھلے
 غضب مسی لگانا تھا قیامت پان کھانا تھا
 برہ آہو زیادہ شیر نرسے ہو گیا
 مشرقِ نور سے کرتی کا گریباں تیرا
 پانی تھا تری تیغ میں کیا نہرِ چمن کا

تیری مجلس کی چمچی سے پتے ہے خورشید
آفتاب سے ہے پانی مہ کا مل ہوتا،
کاسہ سر کو بنایا جو مرے خاک انداز
اسے فلک کرنا تھا سر پوش کسی سینی کا
کام بندوق دونالی کا کیا کرتا ہے
اسے بت صید فگن خال تری بینی کا
حجام خط یار کو اصلاح دیتے ہیں
چھلتے ہیں تیرے ہاتھ کے پروردگار حرم
پیار دم حق کے جب غیر ملتا ہے انھیں،
میرے اٹھتا ہے کلیجے سے دھواں دود و دن
چو کھٹ پہ رہی اپنی جبیں شام سے تا صبح
کندھی نہ مگر اُس ستم ایجا دے کھولی
نظیر کے مذہب کے متعلق میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نظیر کے اجداد اہل تسنن تھے نہ جانے کس وجہ سے نظیر کے والد نے یا
نظیر نے شیعہ مذہب اختیار کیا تھا مگر نظیر کے حالات اور کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں حُب اہل بیت کے علاوہ کوئی
دوسری شیعہ نشانی نہ تھی خلیفہ جی البتہ ذرا "اشد" معلوم ہوتے ہیں مقلدوں یعنی سنیوں پر ایک جگہ چوٹ کی ہے۔
خدا ہمیشہ مجھے اس مقلدی سے بچائے کہ دل میں بغض علی نام ہے غلام علی
خلیفہ جی نے نعت اور منقبت میں بہت شعر کہے ہیں مگر کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکے، البتہ جریدتین کا مضمون اس
کثرت سے باندھا ہے کہ کسی شاعر نے اس قدر شعر اس مضمون کے نہیں کہے ہیں اس موضوع کی حد تک خلیفہ جی
جریدہ ہیں۔

بعد مردن بھی میرے دل کے پھلک پھوٹتے ہیں
چبھتے جاتے ہیں جریدوں کے بدن میں کانٹے
شاخ سد رہ کا نہ جبریل کا رستہ دیکھو
دو جریدوں کی جگہ رکھ دو کفن میں کانٹے
تر رکھا جو اشکوں نے عصائے بغلی کو
شاخوں میں جریدوں کے لگے پیر لحد میں
خلیفہ جی کے دیوان کے مطالعہ سے ایک عجیب و غریب توارد کا پتہ چلا، ایک شعر بہت مشہور ہے:-
کون سنتا ہے فغانِ درویش
قہرِ درویش بجانِ درویش
یہ شعر اس قدر مشہور ہے کہ بچے بچے کی زبان پر ہے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ کس کا شعر ہے، یہ شعر حکیم مومن خاں
کا ہے جو اُن کی تیسری مثنوی میں ہے، خلیفہ جی کے دیوان میں ایک غزل ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:-
کون سنتا ہے فغانِ درویش
کون ہے مرتبہ دانِ درویش
چاہئے بند زبانِ درویش
قہرِ درویش بجانِ درویش
خلیفہ جی کے پہلے مطلع کا پہلا مصرع اور دوسرے مطلع کا دوسرا مصرع مومن کا شعر بنتا ہے خلیفہ جی اور مومن
معاصر ضرور ہیں مگر سرقہ نہ تو مومن نے کیا ہے نہ خلیفہ جی نے یہ بھی بڑے مزے کا توارد ہے۔
چونکہ خلیفہ جی پر لکھنؤ کا اثر بہت تھا اس لئے محاوروں کے استعمال کی کوشش بھی کی ہے اور بہت

محاورے استعمال کئے ہیں :

صاحب زکوٰۃ حسن کے ہم بھی ہیں مستحق
تشنہ لب خوبی قسمت سے تور ہتا ہے اسیر
محاوروں کے شوق میں دل دریا جیسا بازاری محاورہ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔
خیرات اپنی ہم کو بھی دو دار پھیر کر
ورنہ اسے یار ترایار تو ہے دل دریا

چونکہ کالی بیگم (افیون) کے شیدائی تھے اس لئے مٹھاس پر جان دیتے تھے یہی وجہ ہے جو بعض مٹھے میٹھے
شعر کہے ہیں :

خون میٹھا عشق شیریں کے اثر سے ہو گیا
پینک میں بھی خلیفہ جی نے شاعری کی ہے شعر ملاحظہ ہو :-
بند بند اپنا زیادہ نے شکر سے ہو گیا

دنیا خیال و خواب ہے اور میں بھی خواب ہوں
دیکھا کوئی مکاں نہ مکیں آسمان پر
یہ دیکھتا ہوں خواب میں میں خواب دوسرا
صاحب ہمیں زمیں پہ ہمیں آسمان پہ۔
خلیفہ جی کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن پر تصوف کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر ان میں بھی کوئی بات نہیں۔

خلیفہ اسیر ایک پرگو صاحب مذاق اور واقف فن شاعر تھے زبان پر بھی خاصا عبور تھا درجہ دوم کے شعراء
میں ان کا شمار کیا جاسکتا ہے گو ان کی شاعری میں کوئی خاص بات نہیں ہے مگر کلام اس قابل بھی نہیں کہ بالکل نظر انداز
کر دیا جائے، نظیر کی ہمہ گیری اور روانی ان میں نہیں ہے مگر پھر بھی ایک اُپچ ضرور ہے، چونکہ تریا کئی قدیم تھے اسلئے
پینک میں بڑی دور کی کوڑی لاتے تھے، سوزن اور رشتہ سوزن ایک پامال مضمون ہے دیکھئے اس کو کس عمدگی سے
باندھا ہے :

دامنِ دشت پہ ہر گام میں کم ہوتی گئی،
فلسفہ رنج و راحت کو کس مزے سے بیان کیا ہے،
زندگی اپنی مگر رشتہ سوزن نکلی
راحت بغیر رنج کے ملنا محال ہے
جنت میں جائے گا جو جہنم میں گھر ہوا

اس قسم کے بیسیوں شعرا ان کے دیوان میں موجود ہیں مبتذل اشعار بھی ہیں اور ثقہ بھی، عمدہ بھی خراب بھی بہر حال
اسیر کا دیوان ایک گلدستہ ہے جس میں ”پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی“ مگر ”جو گل کے جویا ہیں انھیں کیا خار کا کھٹکا“

تمکین کاظمی

دستان ابرو باد

لاکھوں برس پہلے کی بات ہے کہ جب کرہ زمین کے مشتعل معدنی اجزاء آہستہ آہستہ سرد ہونے لگے، تو وزنی عناصر (جیسے سونا، چاندی، تانبہ اور لوہا) مرکز زمین کی طرف مائل ہوئے اور ہلکے عناصر (جیسے ہیلیم، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن) سطح پر رہ گئے جن کے امتزاج کا دوسرا نام فضا (Atmosphere) ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہوا کی موٹی تہ جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے، اس کا وزن ۶ ہزار بلین ٹن ہے (یعنی ۱۰ اکھرب ٹن)۔

ہوا میں پھیل جانے کی صلاحیت، سو سال قبل مسیح ہی میں معلوم ہو چکی تھی اور اس کے دباؤ کا حال بھی گلیلو کے ایک اطالوی شاگرد کو معلوم ہو چکا تھا جس نے پارہ کا تھرمائیٹر ایجاد کیا۔ ہوا کا دباؤ ہر مربع انچ پر ۱۴.۷ پونڈ دریافت ہوا ہے، لیکن انسان اس دباؤ کو اس لئے برداشت کر سکتا ہے کہ خود اس کے جسم کا اندرونی دباؤ بھی اتنا ہی ہے اور وہ ہوا کے دباؤ کو سنبھالے رکھتا ہے۔

صاف ہوا، انسان کی صحت و زندگی کے لئے بڑی ضروری چیز ہے۔ اس میں تھوڑا سا نم بھی ہونا چاہئے، کیونکہ خشک ہوا میں گرمی بالکل نہیں ہوتی اور تر ہوا میں گرمی پائی جاتی ہے۔ زمین سے متصل حصہ ہوا کا نسبتاً زیادہ گندہ اور بھاری ہوتا ہے، اس لئے خالص ہوا زمین سے ۶۶ فٹ بلندی پر سیرا سکتی ہے اور صحت گاہیں بلند مقامات پر قائم کی جاتی ہیں۔

شہروں کی ہوا خراب ہونے کا سبب یہی ہے کہ اس میں مختلف چیزوں کے ذرات مل جاتے ہیں جس چیز کا نام کُہر ہے وہ یہی ذرات ہیں جن میں آفتاب کی روشنی نفوذ نہیں کر سکتی۔ ایک ڈاکٹر کا بیان ہے کہ برطانیہ کے جزیرہ میں ہر سال ۱۵ لاکھ ٹن خاک کے خراب ذرات ہوا میں مل جاتے ہیں اور لندن کی فضا میں سالانہ ۵ لاکھ ٹن ذرات گندھک کے پائے جاتے ہیں۔

خشک ہوا میں ۸ فی صدی مسدود پانی جاتی ہے، ۲۱ فی صدی آکسیجن، ۷۳ فی صدی آرگن (Argon) اور ۶ فی صدی کاربن۔ پھر گیس اور بھی تھوڑی تھوڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ اگر ہوا میں آکسیجن کی مقدار گھٹ کر ۱۸ فی صدی رہ جائے تو شمع کُل ہو جائے اور اگر ۸ فی صدی رہ جائے تو انسان دم گھٹ کر مر جائے۔ زمین کے دو پھیپھے ہیں، بایاں پھیپھاڑا ادا ہے اور داہنا شمالی سا بحیرہ جاڑوں میں یہ پھیپھاڑے گرم ہوا کی بڑی مقدار اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور سرد ہوا فراہم کرتے ہیں۔ گرمیوں میں ان کا یہ عمل الٹ جاتا ہے۔

زمین کے چاروں طرف فضا کی اتنی شفافیت ہے کہ آفتاب کی روشنی برابر آتی رہتی ہے۔ لیکن اس کی گرمی، ہم فیصدی فضا میں جذب ہو جاتی ہے۔ اگر ہم زمین کی گہرائی کی طرف چلیں تو ہر سو فٹ پر ایک درجہ حرارت بڑھا ہوا نظر آئے گا اور اگر ہم اوپر چڑھیں تو ہر ۳۰۰ فٹ پر نصف درجہ حرارت گرا ہوا معلوم ہوگا۔

کرہ زمین کے چاروں طرف جو گیسیں پائی جاتی ہیں وہ بہت ہلکی ہیں لیکن زمین کی کشش کی وجہ سے وہ بہت اوپر جا کر ختم نہیں ہو جاتیں۔ پھر بھی بعض گیسیں ایسی ہیں (مثلاً ہائیڈروجن اور ہیلیم) کہ وہ بھاگ ہی نکلتی ہیں اور زمین اُن پر پورا قابو نہیں رکھ سکتی۔

چاند کے چاروں طرف بھی کسی وقت گیسوں کی فضا پائی جاتی تھی لیکن اب وہ خلا میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئی ہے۔ عطارد جو ہماری زمین کے بیسیویں حصہ کے برابر ہے، کرہ ارض کی طرح کوئی فضا نہیں رکھتا۔ زہرہ کے گرد البتہ ویسی ہی فضا پائی جاتی ہے جیسی زمین کے گرد، اس لئے اگر ہم وہاں پہنچ جائیں تو زندہ رہ سکتے ہیں۔

ہوا جتنی گرم ہوگی، بادل اتنے ہی اونچے ہوں گے۔ یعنی اگر خط استوا پر جہاں کی ہوا زیادہ گرم ہوتی ہے بادل چھ میل کی بلندی پر ہوں گے تو منطقہ بارودہ میں (مثلاً گرین لینڈ) ان کی بلندی نصف میل سے زائد نہ ہوگی۔ شمالی یورپ میں جہاں سردی زیادہ ہوتی ہے دوسرے موسموں میں بادلوں کی بلندی نصف میل سے ڈھائی میل تک ہوتی ہے اور بارش کے زمانہ میں آدھ میل سے سوا میل تک۔

انسان اس وقت تک زیادہ سے زیادہ چودہ میل کی بلندی تک پہنچ سکا ہے، لیکن غبارہ بیس میل کی بلندی تک گیا ہے۔ ۵۰۰ فٹ کی بلندی پر درجہ حرارت صفر سے بھی ۶۳ درجہ کم ہوتا ہے، ۱۲ میل کے بعد ۲۰ میل تک البتہ ہوا کی تہ میں

پھر گرمی شروع ہو جاتی ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم میں جب جرمنی نے پیرس پر بمباری مار کی تو پیرس سے گولہ باری کی ہے تو گولہ ۲۲ میل اونچا خم پاتا تھا لیکن کراکاتوا (Karaktoa) کے آتش فشاں پہاڑ کا مادہ ۳۰ میل کی بلندی تک اڑ کر پہونچتا تھا۔

بڑی بڑی آندھیاں جو زمین پر آتی ہیں، ان کا سبب ہوا کے وہ موجات ہیں جو ۲۵۰ میل اونچے پیدا ہوتے ہیں تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ۳۰۰ میل کی بلندی پر بھی ہائڈروجن اور نائٹروجن کے منتشر اجزاء فضا میں پائے جاتے ہیں۔

دنیا کی قیمتی چیزوں میں گیسوں کا بھی شمار ہوتا ہے بعض گیسیں تو سونے اور پلاٹینم سے زیادہ قیمتی ہیں کیونکہ ان میں موسم کا مقابلہ کرنے کی بڑی زبردست قوت پائی جاتی ہے۔ قیمتی گیسیں ہوا میں بھی پائی جاتی ہیں اور سمندروں کے پانی میں بھی بلکہ پانی میں ہوا سے زیادہ۔

ان گیسوں میں اس وقت ہیلیم (Helium) گیس کی بڑی قدر ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ ہلکی گیس ہے اور آگ کو قبول نہیں کرتی۔ غباروں میں اب اسی گیس سے کام لیا جاتا ہے اور اس کا ذخیرہ سب سے زیادہ امریکہ کے پاس ہے۔

قطبین کے پاس، ہوا کے ذرات زمین کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت دو چنڈ رفتار سے گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ آندھیوں کا تعلق ۵۲۰ میل بلند فضا کے موجات سے ہے، اس لئے اکثر و بیشتر آندھیوں کا رخ اوپر ہی کی طرف ہوتا ہے ورنہ تباہ ہو جائے۔

امریکہ میں بہت زیادہ آندھیاں آتی ہیں یعنی وہاں سالانہ ۱۳۰ آندھیوں کا اوسط ہے اور سیکڑوں جانیں ان سے تلف ہو جاتی ہیں۔ ان کی رفتار ۵۰ میل سے ۵۰۰ میل فی گھنٹہ تک ہوتی ہے۔ سلسلہ میں آندھیوں کے سلسلہ نے لوئی سیانا (Louisiana) سے لیکر ورجینیا (Virginia) تک سیکڑوں آدمیوں کو ہلاک کیا۔ ۱۸۹۶ء میں سنٹ لوئی (St. Louis) کو آندھیوں نے ۲۰ لاکھ پونڈ کا نقصان پہونچایا اور سلسلہ میں یہاں کی ۵۵۰ عمارتیں مسمار کر دیں۔ سلسلہ میں ایک آندھی نے فلوریڈا کے بارہ سوا اور گواڈلوپ کے ۱۲۰ آدمیوں کی جانیں لیں۔ یورپ میں آندھیاں کم آتی ہیں لیکن سلسلہ کی آندھی نے فرانس کے جنگلوں میں ۵۰ ہزار درخت ہڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیئے۔

یورپ میں ہوا چکیوں کا رواج صلیبی جنگوں کے وقت سے ہوا ہے، جو ایران سے وہاں پہونچا تھا لیچیم میں ایک ہوا چکی بارہویں صدی کی اب تک پائی جاتی ہے۔ ہالینڈ میں ۲۵۰ چکیاں مختلف قسم کے کام کرتی ہیں۔ چین میں بھی انکے ذریعے سے آبپاشی ہوتی ہے۔

بارش کے قطرے گرمیوں میں بہ نسبت جاڑوں کے زیادہ بڑے ہوتے ہیں، یعنی گرمیوں میں ان کا قطر $\frac{3}{4}$ انچ سے $\frac{1}{2}$ انچ تک ہوتا ہے۔ بارش کے قطرہ کا وزن اوسطاً ۰.۰۲ گرام ہوتا ہے۔ یہ ۲۵ فٹ فی سکند کی رفتار سے زمین پر آتا ہے۔ بارش کا اوسط مختلف ملکوں میں مختلف ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش، آسام کے پہاڑی مہتمام چراپونچی میں ہوتی ہے جہاں کا سالانہ اوسط چار پانچ سوا انچ ہے۔

گہر بھی ایک قسم کا بادل ہی ہے لیکن زمین سے متصل جب زمین کے بخارات میں دھوئیں کے اجزاملجاتے ہیں اور وہ بخارات اوپر نہیں اٹھ سکتے تو گہر بن جاتے ہیں۔ گہر سے بھی دنیا کو بہت نقصان پہنچتا ہے، چنانچہ ۱۹۵۷ء کے گہر نے انگلستان کو ایک کروڑ پونڈ کا نقصان پہنچایا۔ فروری ۱۹۵۷ء میں ایک دن ایسا آیا تھا جب سارے یورپ کو گہر کی چادر نے لپیٹ لیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے تمام کام معطل ہو گئے۔

گرج کا طوفان بھی بادلوں ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ جب دو ہوائیں مختلف سمتوں میں چلتی ہیں تو ٹھنڈی ہوا اوپر سے آکر گرم ہوا میں داخل ہوتی ہے اور اس سے پانی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ ہوا پانی کے قطروں میں انجماد پیدا کر دیتی ہے اور انھیں کا نام آدلا ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ کرۂ زمین پر سالانہ ایک کروڑ ۲۰ لاکھ گرج کے طوفان آتے ہیں اور ۶ لاکھ بار بجلی کی چمک روزانہ پیدا ہوتی ہے۔ طوفان کے دوران میں بجلی ۲۰۰ مرتبہ فی گھنٹہ چمکتی ہے۔ بجلی فی الحقیقت ایک شعلہ یا چنگاری ہے جو زمین و بادل یا دو بادلوں کے درمیان تناؤ یا کشش کے دباؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں ۵۰ کروڑ گھوڑوں کی قوت پنہاں ہوتی ہے اور اس کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکند ہے۔

گرم ممالک میں گرج کے طوفان زیادہ آتے ہیں۔ جہاں سب سے بڑا مرکز ان طوفانوں کا ہے جہاں ہر سال اوسط ۲۲۳ طوفان آتے ہیں۔

بجلی سے فائدہ بھی دنیا کو پہنچتے ہیں اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے سالانہ دس کروڑ ٹن نائٹروجن پیدا ہوتا ہے جو زمین کو زرخیز بنانے کے لئے ضروری ہے۔ اور نقصان یہ کہ بہت سے درختوں میں اس سے آگ لگ جاتی ہے، فصلوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور جانیں بھی ضائع ہوتی ہیں۔

گرج کی رفتار تقریباً سکند میں ایک میل ہے، اس لئے اگر گرج چار میل دور ہو تو ٹیلی فون سے آپ تقریباً ۱۸ سکند پہلے اس کی آواز کو سن لیں گے۔ گرج کی آواز میں بازگشت پیدا ہوتی ہے ہوا کی اُن تہوں سے جو مختلف دبازت و مہر پر رکھتی ہیں۔

موسم سے مراد فضا کی وہ کیفیت ہے جو کسی مخصوص حصہ زمین میں کچھ عرصہ تک قائم رہتی ہے، خط استوا کے نیچے جتنے مقامات ہیں وہ زیادہ گرم ہوتے ہیں، کیونکہ آفتاب کی کرنیں یہاں سیدھی پڑتی ہیں۔ زمین کے ٹیپر کچے کا اوسط ۱۶ درجہ سنٹی گریڈ ہے لیکن ترکستان میں وہ ۵۰ تک بڑھ جاتا ہے اور گرین لینڈ میں صفر سے بھی نیچے ۹۰ درجے تک گر جاتا ہے مخلوقات میں صرف انسان اور کتا دو ہی جاندار ایسے ہیں جو اپنے آپ کو مختلف موسموں کا عادی بنا سکتے ہیں خصوصیت کے ساتھ سفید اقوام میں یہ اہلیت زیادہ پائی جاتی ہے۔

تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ہر حصہ زمین کا موسم بھی بدلتا رہتا ہے، یعنی جو جگہ پہلے گرم تھی وہ سرد ہوتے جا رہے ہیں اور جو سرد تھی وہاں گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا سبب آفتاب کے تغیرات کو قرار دیا جاتا ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے دنیا کا سب سے زیادہ خشک مقام خرطوم ہے جہاں کی ہوا میں نمی کی مقدار صرف ۸ فیصد ہے اور سب سے زیادہ مرطوب جگہ کیرون پہاڑ کا دامن ہے جہاں کی ہوا میں ۹۲ فی صدی رطوبت پائی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ ابر آلود مقام روس کا جزیرہ نمائے کو لا ہے جہاں تقریباً ہمیشہ بادل گھرے رہتے ہیں اور سب سے زیادہ صاف فضا چلی کے ایک شہر کلا ماکا کی ہے جہاں اب کبھی نظر نہیں آتا۔

جزائر جلاوٹ (Jalut Islands) میں سال کے ۳۳۶ دنوں میں برابر بارش ہوتی رہتی ہے اور دریائے نیل کی وادی حلقہ میں دس دس برس تک پانی کا ایک قطرہ نہیں گرتا۔ دنیا میں سب سے زیادہ بارش ہوائی کا ایک مقام ویلی (Waialeale) میں ہوتی ہے، جہاں کا اوسط ۵۸۰ انچ ہے سب سے زیادہ تیز بارش جزائر فلپائن کے ایک مقام باگیو (Baguio) میں ہوتی ہے جہاں ایک بار چوبیس گھنٹے میں ۴۶ انچ بارش ہو گئی۔

زمین کو آفتاب سے جتنی گرمی پہنچتی ہے اس کی مقدار بہت کم ہے یعنی آفتاب کی گرمی کو ہم ۴۰ سال فرض کر لیں تو اس میں سے صرف ایک سکندڑ کا موتی ہے۔ دوسرے سیارے زمین سے دس گنا زیادہ حرارت حاصل کرتے ہیں اور باقی حرارت ضائع ہو جاتی ہے۔ آفتاب کی شعاعیں زمین تک فی صدی چالیس کے اوسط سے پہنچتی ہیں ۲۰ فی صدی فضا میں جذب ہو جاتی ہیں اور ۴۰ فی صدی واپس پلٹ جاتی ہیں۔ اگر آفتاب کی کرنیں جن کا درجہ حرارت دس ہزار یقین کیا گیا ہے، دس فی صدی گرمی کھودیں تو دنیا کے گرم تر مقامات بھی منجمد ہو جائیں۔

انقلاب پسندی اور اصلاح عالم

عہدِ حاضر کو اگر انقلاب کی پرستش کا دور کہا جائے تو حقیقت سے چنداں بعید نہ ہوگا۔ یوں تو اس کی حمایت و تعریف میں صفحے ہی نہیں متعدد صحیفے سیاہ کئے جا چکے ہیں۔ خصوصاً انقلاب پسند جماعت نے اس خواب کو ”رویا و صداقت“ بنا کر پیش کر دیا ہے۔ لیکن جہاں تک سنجیدہ غور و فکر کا تعلق ہے بہت کم حضرات اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ مجھے اپنی نااہلی کا اعتراف ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ میری لب کشائی اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لے اور میری غلطیاں مجھ پر روشن ہو جائیں۔

لفظ انقلاب کی عالمگیری نے اس کے معنی میں اتنی وسعت پیدا کر دی ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا لفظ اپنے اندر اتنے مختلف و متضاد پہلو رکھتا ہو۔ لفظی معنی تو محض الٹ جانے یا گردش کھا جانے کے ہیں۔ وقت اس کی اصطلاحات سے شروع ہوتی ہے۔ عموماً نظام معاشرت یا نظام حکومت کے دفعتاً بالکل بدل جانے پر لفظ انقلاب کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے جدوجہد کو بھی انقلاب کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ذہنی انقلاب تو بہر حال ہو ہی جاتا ہے۔ جب دو طبقے یعنی اعلیٰ اور ادنیٰ باہم متصادم ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یا غالب ہو جاتے ہیں تو اسے بھی انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔ اس دور میں تو ترقی کی ہر کوشش اور اس کے لئے باہم جنگ آزمائیاں بھی انقلاب کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ اگر انقلاب کو اس کے وسیع ترین تخیل میں دیکھا جائے تو یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ انقلاب ایک فطری تقاضہ ہے۔ انقلاب و ارتقاء ظاہر و متضاد چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ایک ہی واقعہ اگر آج اپنے جزئیات کی وجہ سے انقلاب معلوم ہوتا ہے تو کل یہی ارتقاء کے نام سے یاد کیا جانے لگے گا۔ مثال کے لئے اپنے ہی دور کو لیجئے۔ کیا یہ دور انقلاب نہیں ہے؟ لیکن کچھ مدت کے بعد اگر ہماری یہی رفتار رہی تو آنے والی نسلیں یہی سمجھیں گی کہ ہم برابر اتقائی منازل طے کر رہے تھے۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے زمانہ ماضی کی رفتار ہم کو سوائے ارتقاء کے دوسری چیز نظر نہیں آتی۔ لیکن آج کی فرصت میں میرا دئے سخن اس قسم کے انقلاب کی طرف نہیں ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں عوام بھی انقلاب سے یہ معنی نہیں لیتے۔ انقلاب کا نام لیتے ہی ذہن فوراً اس بناوت و بد امنی، قتل و غارت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو انقلاب فرانس یا روس کا طرہ امتیاز رہا ہے اور جس کی لازمی شرط ایک طبقہ کا دوسرے طبقہ پر جبر و غلبہ حاصل کر لینا ہے، اس کے انقلاب کہے جانے پر تو چنداں اعتراض نہیں ہے۔ لیکن مابہ النزاع مسئلہ یہ ہے کہ یہ ہماری رفتار ترقی کا معاون ہو یا

مخالفت۔ یہ ہماری ارتقائی منزلوں کا زینہ ہے یا راہ کا ایک سنگ گراں۔

ماضی عموماً حال مستقبل دونوں کی آئینہ داری کیا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس باب میں بھی ہماری رہنمائی کرے اور تاریخ کی ورق گردانی سے ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ لیکن پہلے اس پر غور کر لینا چاہئے کہ انقلاب کیوں ہوتا ہے اور اسکی رفتار کا کیا رخ رہتا ہے۔ سوال کا پہلا جزو آسان ہے۔ وقت اس کے دوسرے حصہ سے شروع ہوتی ہے اور یہی ہمارا موضوع بحث ہے۔

عوام میں اضطراب و بے چینی جب حد کو پہنچ جاتی ہے۔ جب مصائب کے برداشت کرنے کی قوت مفقود ہو جاتی ہے اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے، خصوصاً اس وقت جب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ طبقہ جو نسبتاً خوشحال اور برسر اقتدار ہے ان سے مطلق ہمدردی نہیں رکھتا اور اپنی رنگ رلیوں میں مست اور بے خود ہے تو بدبختی اور بدحالی کا احساس اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ یہ انتقام پر اتر آتے ہیں اور شر و فساد اور قتل و غارت کا طوفان موجیں مارنے لگ جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عوام الناس کی مصیبت اور افلاس تو ہر ملک اور ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انقلاب شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوئے؟ اس کے دو اسباب ہیں، ایک سیاسی اور دوسرا ذہنی۔ سیاسی یہ کہ اگر حکومت مضبوط رہی تو محکوم لاکھ بد حال، بظن اور مضطرب ہو کر بھی کامیاب بغاوت نہیں کر سکے، ایک قومی اور چوکس حکومت انھیں ابھرنے کے قبل ہی دبا دے گی۔ عوام تو درکنار، خواص تک یہاں پر غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انقلاب حکومت کو کمزور نہیں کرتا بلکہ یہ خود حکومت کی کمزوری کی علامت ہے۔ بدامنی اور بغاوت زوال پزیر حکومتوں کے لوازم میں داخل ہیں چنانچہ واقعات تاریخ اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک مضبوط حکومت کتنا ہی ظلم کر جائے اور عوام کے حقوق کی کتنی ہی پامالی کرتی رہے۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی اس کے برصلاوت حکومت میں جہاں کمزوری آئی اور معمولی معمولی باقیں فساد برپا کرنے لگیں۔ دوسری طرف جسے انقلاب کا داخلی یا ذہنی سبب بھی کہہ سکتے ہیں انقلاب اگرچہ عوام الناس کے ذریعہ وقوع پذیر ہوتا ہے، لیکن درحقیقت چند خواص ہی اس کے بانی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کی کامیابی کے لئے ایک یا چند نباض فطرت انقلابیوں کا وجود بھی از بس ضروری ہے۔ محض عوام کی نمکیت و پستی انھیں نہیں ابھارا کرتی، بلکہ یہ اس وقت ابھرتے ہیں جب انھیں اپنی پستیوں کا احساس ہو جاتا ہے۔ احساس پیدا کرنے والے ہی چند انقلابی ہیں اور اسکی بولناکیوں کے ذمہ داری بھی چند اشخاص قرار دئے جاسکتے ہیں۔ یہاں پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایسے لوگوں کی حسی قوت بہت تیز ہوتی ہے اور اپنے ماحول سے یہ بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں وہی مصائب جو عوام پر کچھ اثر نہیں کرتے انھیں مضطرب کر دیتے ہیں ان کا اضطراب دوسروں کو ابھارتا ہے پورے ملک میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ پہلے کے خوشحال اور برسر اقتدار طبقہ کی دنیا دفعتاً بدل جاتی ہے۔ حکومت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عنان اقتدار انقلابیوں کے قبضہ میں چلی جاتی ہے۔

سوال اب یہ ہے کہ درحقیقت انقلاب کا مقصد پورا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کی غرض محض تخریب ہے تو اس کے کامیاب ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ متداول انقلاب پسند جماعت کہا بھی کرتی ہے کہ تعمیری اقدام کے لئے موجودہ فرسودہ نظام کا انہدام ضروری ہے۔ بنا بریں ایک کامیاب انقلاب کے لئے کشت و خون، قتل و غارت لازمی شرط ہے۔

سکھ کی اہمیت ظاہر ہے اور اس پر ذرا وضاحت سے بحث نامناسب نہیں معلوم ہوتی، ممکن ہے کہ میرے اس قول پر کہ انقلاب اپنے تعمیری مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا بلکہ صحیح معنوں میں اسے رجعت پسندانہ اقدام سمجھنا چاہئے، قارئین کو تعجب ہو۔ لیکن گزشتہ انقلابات کا مطالعہ مجھے ایسا کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس وقت میرے پیش نظر کم از کم پانچ ناکام انقلابوں کی رودادیں ہیں اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ طبقوں کی نزاع یا بھی کے نعرے محض عوام کو فریب دینے کے طریقے ہیں، جس سے ملک بجائے فائدہ کے سخت نقصان اٹھاتا ہے۔ کیونکہ عوام جو کچھ کر گزرتے ہیں وہ محض فوری جوش و خروش کا اثر ہوتا ہے۔ تخریب کے لئے تو یہ حربہ کارگر ہو سکتا ہے۔ لیکن تعمیری اقدام تا وقتیکہ بہت غور و فکر اور نہایت سنجیدگی سے کام نہ لیا جائے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انتقامی جذبہ کے تحت عوام نظام حکومت، نظام تمدن، نظام معاشرت وغیرہ کو کامیابی کے ساتھ تاخت و تاراج تو ضرور کر دیتے ہیں لیکن جب تعمیر کی نوبت آتی ہے تو ان کے بنائے کچھ نہیں بنتا اور ایک سربراہ آوردہ و منظم جماعت کے ہاتھ پر انھیں بیعت کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ چند نفوس محض اپنے تفوق کے لئے (Class Struggle) کے نعرے لگا کر عوام کو اپنا آلہ کار بنالیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ خود غرض جماعت ملک و قوم کا کتنا درد اپنے سینہ میں رکھتی ہوگی؟ اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ جو کچھ یہ کرتی ہے خلوص دل اور قوم کی محبت کے سبب سے کرتی ہے، پھر بھی اس کی نااہلی منزل مقصود تک اسے پہنچنے نہیں دیتی۔ اور نادانوں کی دوستی۔ عقلمندوں کی دشمنی سے زیادہ مضرت ثابت ہوتی ہے۔ میں انقلاب کو رجعت پسندانہ تحریک کہ گیا ہوں۔ پہلے اسی پر ایک نظر غائر ڈال لینی چاہئے۔

عوام میں اضطراب، ضروریات زندگی کی عدم فراہمی، حقوق کی پائیالی اور حکمران طبقہ کا ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کی بنا پر تقویت حاصل کرنا ہے اور انھیں شکایات کو دور کرنے میں وہ کوشاں رہتے ہیں۔ کبھی تو حکومت ان کے کچھ مطالبات قبول کر کے ان کی اشک شونی کر دیتی ہے اور کبھی انھیں خاموش رکھنے کے لئے ان کا رویہ اور بھی جارحانہ ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ حاکم و محکوم میں ایک طرح کا مول تول ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس سے انکار ناممکن ہے کہ ہزار کچھ نہ ہونے پر بھی عوام کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھاتے ہی جاتے ہیں اور حکومت آہستہ آہستہ ان کے مطالبات قبول کرتی جاتی ہے کیونکہ ایک بار عوام میں ہستی کا احساس ہو جانے کے بعد کوئی قوت بھی اسے نہیں دبا سکتی اور ذہنی انقلاب بڑی بڑی سلطنتوں تک کے پایہ عزم و ثبات کو متزلزل کر دیتا ہے لیکن اسی دوران میں قوم میں ایک ایسی جماعت بھی پیدا

ہو جاتی ہے جسے عام طور سے ”گرم دل“ کہتے ہیں اس کے افراد فطرتاً جو شیلے اور رجعت پسند ہوتے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ جتنا بھی بلند ہو سکے ہر ممکن طریقہ کو بروئے کار لاکر حکومت کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں جس کا طریقہ سوائے کھلی ہوئی بغاوت کے انھیں دوسرا نہیں نظر آتا۔ عوام میں اتنی صلاحیت کہاں کہ تدریج و میاند روی کی خوبیوں کو سمجھ سکیں۔ ذرا شہ پاتے ہی یہ اُبل پڑتے ہیں، اگر حکومت میں کچھ دم ختم ہوا تو بغاوت و بادی گئی اور اس سختی سے انتقام لیا گیا کہ ایک زمانہ کے لئے ترقی کی ساری اُسیدیں خواب و خیال ہو کر رہ گئیں اور اگر حکومت کمزور ہوئی تو پورے ملک میں شرفساد کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور عوام الناس کی ایک اچھی خاصی جماعت بھی گھن کی طرح پس جاتی ہے۔ نئی حکومت چونکہ خون کا دریا بہا کر اقتدار حاصل کرتی ہے۔ قیام حکومت اور انتظام سلطنت کے لئے بھی اسے کشت و خون ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے، شروع میں تو عوام کی مدد سے۔ عوام کے نام پر اور عوام کا ایک جزو بن کر یہ اُٹھتی ہے۔ لیکن قوت حاصل کرتے ہی اسکے اد جہور کے درمیان پھر پہلا جیسا بعد المشرقین حایل ہو جاتا ہے ابتدا میں تو عوام اس تبدیلی کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ تازہ کاریابی سے ان کی آنکھیں چونڈھیا کی رہتی ہیں۔ اور وہ اس امید موموم پر بھولے رہتے ہیں کہ جب حکومت ہی ہماری ہو گئی تو پھر مطالبات کا کیا ذکر؟ جو چاہیں گے اور جیسے چاہیں گے کر لیں گے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شروع میں یہ من مانی کر بھی لیتے ہیں لیکن بہت جلد ان پر روشن ہو جاتا ہے کہ کوئٹے سے نکل کر یہ کھائی میں جا گرے ہیں۔ انقلابی حکومت استحکام پاتے ہی ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ پہلی حکومت میں تو خیر شہتہا پشت کے اشرافیت کی بعض خوبیاں بھی تھیں اُن نو واردوں میں تو اس کا شتمہ بھی نہیں ہوتا۔ دلولہ و جوش، عزم و ثبات کی تو فراوانی ہوتی ہے لیکن وہ محاسن جو شرفاء کے طرہ امتیاز اور انسانیت کے جزو لاینفک ہیں ان کے پاس مطلق نہیں ہوتے۔ دولت و حکومت کا نشہ انھیں کچھ اس طرح مخمور کر دیتا ہے کہ دوسروں کو یہ بالکل بھول جاتے ہیں اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ہر ممکن جبر و تعدی کو بروئے کار لانے میں نہیں چوکتے۔ عوام اس وقت چونکتے ہیں جب حکومت کی زنجیریں انھیں اچھی طرح جکڑ چکتی ہیں۔ مزید براں عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے عموماً حکومت کوئی ایسا کھلونا بھی پیش کر دیتی ہے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر یہ اس میں محو ہو جاتے ہیں۔ انقلاب فرانس کے بعد چونکہ فوراً ہی ملک پر بیرونی حملے شروع ہو گئے تھے پورے ملک کو فانی الجہد و جہد ہو جانا پڑا۔ انقلاب روس کے بعد کچھ دنوں تک تو خانہ جنگی جہور کو بہلائے رہی اور اس کے بعد جو لوگ ذرا چونکے تو اصلاحات کے بعض کھلونے ان کو دیدیے گئے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اتنی سخت پابندیاں بھی عاید کر دی گئیں کہ یہ چوں چیرا تک نہ کر سکے۔ پھر یہ تو ممکن ہے کہ اس طرح ان کی معاشی حالت کچھ درست ہو جائے۔ لیکن ذہنی موت تو یقیناً ہو جاتی ہے، شہری زندگی کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسانیت کی منزل سے اتر کر یہ حیوانیت کے قریب تر آ جاتے ہیں۔ اور اس طرح انقلاب کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ملک کی رفتار اگر پیچھے کی طرف مراجعت نہیں کر جاتی تو رک یقیناً جاتی ہے۔

انقلاب فرانس اور انقلاب روس کے افسانے آج گھر گھر دہرائے جا رہے ہیں اور بنی آدم کے لئے انھیں ایک غیر مشروط چیز سمجھا جا رہا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں انھیں کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں؛ تفصیلی بحث کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے، انقلاب کے بعد واقعات کی طرف محض اشاروں پر اکتفا کر دینا لیکن اس کے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ انقلاب فرانس اور اس کے واقعات انقلاب پسند جماعت کے طفیل کچھ اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ حقیقت سے زیادہ ان میں جذبات کا اثر حلول کر گیا ہے۔ چند ناموں اور چند مقولوں کو اس طرح اچھالا گیا ہے کہ ان میں ایک خاص کیفیت اور عظمت پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے اغلب ہے کہ میرے خیالات جو عام انداز گفتگو کے بالکل برعکس ہیں، بعض حضرات کو مضحکہ خیز معلوم ہوں اور بعض طیش میں بھی آجائیں لیکن گزارش احوال واقعی ضروری ہے۔

اہل نظر سے انقلاب فرانس کے اسباب پوشیدہ نہ ہوں گے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ملک کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی طبقہ امرا کے مظالم اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ شاید ہی کسی ملک میں عوام کے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک کیا جاتا ہو اس میں مطلق مبالغہ کو دخل نہیں ہے کہ سچ مچ انھیں جانور سمجھا جاتا اور یہی سلوک کیا بھی جاتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی درست ہے کہ فرانس کے لئے یہ بد حالی کوئی نئی چیز نہیں تھی اور نہ لوی شانزدہم کے زمانہ میں (جس کے عہد حکومت میں انقلاب ہوا) عوام کے مصائب میں کوئی خاص اضافہ ہی ہوا بلکہ اس دور میں تو حکومت ان کے مصائب و افلاس کو دور کرنے کی تدابیر و ذرائع بھی تلاش کرنے لگ گئی تھی۔ پھر بھی انقلاب ہوا تو اس دور میں جس کی وجہ یہ ہے جو مندرجہ بالا سطور میں عرض کر آیا ہوں، یعنی ایک تو حکومت میں کمزوری آگئی تھی۔ دوسرے روشواور والٹائر کا جادو اس وقت تک عوام پر کافی اثر کر چکا تھا۔ ملک کو اپنی پستی کا اچھی طرح احساس ہو گیا تھا اور عوام اپنی نکت و بد حالی کے احساس سے مضطرب ہو رہے تھے اس میں جو کمی تھی وہ ۱۷۸۹ء کے سالہ قحط نے پوری کر دی (ٹرگوٹ (Turgot) کی ناکامی کی ایک وجہ یہ تباہ کن قحط سالی بھی تھی۔ ورنہ اس کے اصلاحات سے طبقہ امرا کی رعونت بہت کم ہو جاتی اور عوام الناس کے حقوق کافی حد تک محفوظ ہو جاتے لیکن ایک طرف پادریوں اور نوابوں کی مخالفت اور دوسری طرف قحط کے بنا پر حکومت کی مشکلات نے ٹرگوٹ کا ناطقہ بند کر دیا اس کے بعد نیکر (Necker) بھی انھیں مشکلات کی بنا پر اپنے اصلاحات کو بروئے کار لانے میں ناکام رہا۔ لوی شانزدہم کو بھی اتنا مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا اس غریب کی خامی محض اس کی کمزوری تھی۔ ورنہ اگر امرا پر اس کا بس چلتا تو بات اتنی نہ بگڑتی۔ حکومت کے مالیات میں کمی اور محکوم کی بے چینی کے سبب سے یکے بعد دیگرے وزراء تبدیل ہو رہے تھے۔ اور کوئی بھی حکومت کی کشتی کو پار لگاتا نظر نہیں آتا تھا بار ۱۷۸۸ء میں قلمدان وزارت پھر نیکر (Necker) کے سپرد کرنا پڑا۔ نیکر اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا کرنے سے یہ ڈوبتی ہوئی کشتی ابھر سکتی ہے۔ ۱۷۸۹ء میں اس نے باوجود شدید مخالفت کے *State*

(General) کا انتخاب کراہی لیا۔ پورے ملک میں اس کی مخالفت سے ایک ہنگامہ مچ گیا۔ جگہ جگہ انجمنیں قائم ہو گئیں اور حکومت کو کھلی ہوئی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ پھر بھی امراء ہی میں ایک ایسی جماعت بھی موجود تھی جو حکومت کی دوراندیشی کی قایل اور ہر طرح اس کی امداد پر مکرستہ تھی۔ ڈیوک آف اورلینس (Duke of Orleans) اس جماعت میں بہت ممتاز نظر آتا ہے۔ (States General) نے آئین و قوانین ہی میں نہیں ملک کے (Constitution) تک میں ایسی تبدیلیاں کر دیں کہ اگر یہ قائم رہ جاتیں تو صدیوں کی چند سری حکومت (Oligarchy) فوراً جمہوریت میں تبدیل ہو جاتی لیکن امراء کی مخالفت کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ اور لوئی نے ان اصلاحات کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر بھی اس سے انکار ناممکن ہے کہ سب کچھ ہونے پر بھی حکومت جمہور کے مطالبات کے سامنے بہت جھک گئی تھی اور انھیں کچھ نہ ملنے پر بھی بہت کچھ حقوق مل گئے تھے۔ اس عہد کو اگر نصف صدی پہلے کے زمانہ سے مقابلہ کیا جائے تو حقیقت کھلے۔ لوئی چہارم کے قول *C'est moi, c'est l'etat* (ریاست سے مراد میں ہوں) کا مقابلہ اس عہد کے نعرہ *C'est nous, c'est l'etat* (ریاست سے مراد ہم ہیں) سے کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عوام کی آواز کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ امراء اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ اب ان کے اقتدار کے چند گئے ہوئے دن رہ گئے ہیں اور بہت جلد جمہور کے مطالبات کے سامنے انھیں سر تسلیم خم کر دینا پڑے گا۔

جب اہالیان شہر کو معلوم ہوا کہ (States General) کے مطالبات ٹھکرا دئے گئے ہیں اور نیکر (Nec Kor) بھی برطرف کر دیا جانے والا ہے۔ تو ان میں آگ سی لگ گئی۔ جا بجا مظاہرے شروع ہو گئے اور محل شاہی کے سامنے ان کی ایک بہت بڑی جماعت اکٹھی ہونی شروع ہو گئی۔ لوئی کی حالت ناقابل بیان تھی۔ اگر اس کا دل عوام کی طرف تھا تو دماغ پر خواص قبضہ کئے ہوئے تھے۔ غرض عجیب کشمکش میں غریب کی جان تھی۔ بہر حال موقع کی نزاکت کو سمجھ کر (States General) کے مطالبات اسے قبول کرنے ہی پڑے۔ لیکن اس کے سوا اب اور کیا کہا جائے کہ ناعاقبت اندیش امراء اور عوام کے جوشیلے اور عجلت پسند لیڈروں کا برا ہو کہ بات بنکر بگڑ گئی۔ ایک طرف امراء کی سازشیں نخوت و بددماغی اور دوسری طرف خود غرض لیڈروں کی غیر ذمہ دارانہ کھلی ہوئی بغاوت کی تبلیغ۔ نفرت و ہیزاری کی آگ پرتیل چھڑک رہی تھی۔ اگر ایک طرف غیر ملکی ریجنٹوں کی آمد کا انتظار تھا۔ تو دوسری طرف انقلابی رہنما بھی کسی بہانہ کے منتظر تھے۔ آخر قوم فروش امراء نے لوئی پر اتنا دباؤ ڈالا اور اس بدبخت کو اس طرح بہکایا کہ وہ نیکر کو برطرف کرنے پر رضامند ہو گیا۔ انقلابی تو موقع کی تاک میں تھے ہی۔ جولائی ۱۷۸۹ء کی بارہ تاریخ کو نیکر برطرف کیا گیا اور دفعتاً بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ پورے ملک میں بھونچال سا آگیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ فرانس کی دنیا اٹل گئی ہے۔ انسان درندوں میں تبدیل ہو گئے۔ کشتوں کے پتے لگ گئے اور خون کی ندیاں بن گئیں۔ جب عوام کا جوش غضب ذرا سرد پڑا اور قتل و غارت کا

طوفان تھا تو ہم دیکھتے ہیں کہ نہ کہیں عوام کے حقوق کا پتہ ہے اور نہ ان کے مطالبات کا ذکر۔ اگر نہیں تو چند فتنہ انگیز خلیفہ ولیڈر حکومت ہے تو ان کی اور حقوق ہیں تو ان کے غرض چند الفاس کی مکاریاں اور سفاکیاں مسلسل چھ سال تک پورے ملک پر چھائی رہتی ہیں۔ حکومت کے لئے آئین بھی بنتا ہے۔ نظم و نسق کے لئے قوانین بھی بنائے جاتے ہیں۔ لیکن جمہور کو تو ان سب باتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ فاقوں کا مارا جیسے کھانے پر گرتا ہے۔ یہ بھی آزادی پر ٹوٹ پڑے اور تمام پابندیوں سے آزاد ہو گئے اور ایک دفعہ فرانس میں (State of Nature) کا دور دورہ ہو گیا۔ لیکن یہ روشو (Rousseau) نہیں (Hobbes) کا (State of Nature) تھا۔

۱۷۹۵ء تک فرانس پر کیا گزری۔ ہم لوگوں کے لئے اس کا اندازہ کرنا بھی محال ہے۔ اسے انقلاب نہیں قتل و غارت کا گرداب سمجھنا چاہئے۔ چھ سال کی یہ خونچکاں داستان مشعل ہے صرف سازشوں اور باہم ریشہ دواینوں پر یا اسے قدرت کا انتقام کہئے کہ انقلابیوں کی ہر جماعت دوسری جماعت کی دشمن بن کر سامنے آئی اور سب کے سب آپس ہی میں کٹ مر کے رہ گئے جو پارٹی بھی غالب آتی اپنے پیش رو کو موت کے گھاٹ اتارتی آتی۔ غرض یہ کہ مسلسل چھ سال تک فرانس میں بے درپے انقلاب ہوتے رہے (معدومہ مدہ مدہ) کی عبرت ناک موت کے بعد نصیب ملک کو طوفان انقلاب سے ایک گونہ نجات ملی اور فرانسیسی دینیت سے انسانیت کی طرف آہستہ آہستہ رجوع کرنے لگے۔ جون ۱۷۹۵ء میں گیارہ لوگوں کے کمیشن (The Commission of the Eleven) نے جو دستور العمل پیش کیا اور جس کی رو سے حکومت پانچ افراد کی ڈائریکٹری کے تحت میں آگئی۔ اس پر لفظ قانون کا اطلاق تو ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہاں بھی ذاتیات اور خود پرستی، مال اندیشی اور وطن پرستی پر غالب رہیں ۱۷۹۷ء میں ڈائریکٹری کی حالت اتنی ابتر ہو گئی کہ پھر پہلا حبس نراج (Amarecage) کا دور بہت قریب نظر آنے لگا۔ لیکن عین اسی وقت نپولین بوناپارٹ میدان کارزار سے فرانس کی سیاسی بساط پر آ موجود ہوا اور جس طرح اس نے ملک کو تاج داران یورپ کے شعلہ انتقام سے بچایا تھا، یہاں بھی خانہ جنگیوں کا قلع قمع کر دیا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ فرانس کے لئے نپولین کی اٹھارہ سال کی حکومت رحمت ایزدی سے کم ثابت نہیں ہوئی، فرانس اس دور پر بجا طور سے ناز کر سکتا ہے۔ لیکن کیا انقلاب فرانس کا مقصد یہی تھا کہ ایک نپولین پیدا کر کے خاموش بیٹھ جائے؟ کیا ۱۷۹۷ء میں انقلابیوں کا یہی طمح نظر تھا کہ لوئی شانزدہم کی جگہ کسی نپولین کے قالب میں لوئی چہارم کی روح اپنی پوری شان رعونت کے ساتھ فرمانروائی کرنے لگے؟

تعمیر کو تو بالائے طاق رکھئے۔ اپنی تحزیب تک میں انقلاب افسوسناک طریقہ سے ناکام رہا۔ اشرافیت جسے اس نے حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہا تھا۔ نپولین کے دور میں پھر عود کر آئی۔ اگرچہ اس کے زمانہ تک اسے صلاحیت کی اشرافیت (Aristocracy of merit) کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ۱۸۱۵ء کے بعد پوربون خاندان کے

دوبارہ تخت نشین ہوتے ہی پُرانی اشرافیت اپنی تمام قدیم روایات کے ساتھ پھر ملک پر مسلط ہو گئی۔ ۱۸۳۰ء میں پھر انقلاب ہوا۔ لیکن ۱۸۴۹ء کے انقلاب کے مقابلہ میں اسے صرف حکومت میں تبدیلی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ انگلستان کے ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے بہت مشابہت رکھتا ہے اور حقیقی معنوں میں اسے فرانس کے جمہوری نظام کی پہلی ارتقائی سیڑھی سمجھنا چاہئے۔ لوئی فلپ چونکہ ہزار کچھ ہونے پر بھی بوربون خاندان ہی کا ایک فرد تھا۔ زمانہ کے بدلے ہوئے تیور نہ پہچان سکا۔ آخر ۱۸۴۸ء پھر ریپبلک حکومت قائم ہوئی، جو تاریخ میں دوسری ریپبلک کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن اسے ریپبلک کہنا، ریپبلک پر ظلم کرنا ہے۔ کیونکہ اس کا صدر ایک ایسا شخص تھا جو اس وقت جمہوریت نہیں، شہنشاہیت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ بہر کیف اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عوام کی آوار اب بہت با اثر ہو گئی تھی اور یہ ریپبلک ان کی شاندار فتح کہی جاسکتی ہے۔ ۱۸۵۲ء میں یہ ریپبلک شہنشاہیت میں پھر بدل گئی لیکن ضرور تھا کہ یہ ایسی شہنشاہیت تھی جسے جمہور خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ یہ فرانس میں شہنشاہیت کا سنبھالا یا اس کی آخری بچی تھی جو ۱۸۷۰ء میں شاید ہمیشہ کے لئے دفن کر دی گئی۔

مندرجہ بالا سطور سے مقصد صرف یہ دکھلانا تھا کہ ۱۸۸۹ء کا انقلاب نہ محض ناکامیاب ثابت ہوا بلکہ ملک کی رفتار ترقی اس کی وجہ سے اگر سو سال نہیں تو پچاس سال پیچھے ضرور پڑ گئی۔ اگر فرانس ۱۸۷۹ء میں انقلاب کی لعنت میں گرفتار نہ ہوتا اور اسکے رہنما انگلستان والوں کی طرح تدریجی ترقی کے قایل ہوتے، جیسا کہ ۱۸۳۰ء سے ان کا رویہ ہو گیا۔ تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ۱۸۷۰ء کے بہت پہلے جمہوریت یا Constitutional Monarchy قائم ہو جاتی۔

Prevost نے خوب کہا ہے "اگر جرمنی میں اصلاحات کی ابتدا ہوئی تو انتہا میں یہ انگلستان تک پہنچی۔ لیکن فرانس نے انقلاب کے دعوے دنیا کے سامنے پیش کئے اور خود اس کی بے راہ روی کا شکار بننا رہا۔"

سطر بالا میں عرض کر آیا ہوں کہ ہر چند انقلاب، عوام کے ذریعہ سے وقوع پذیر ہوتا ہے لیکن چند خواص ہی اس کے بانی ہوتے ہیں، انھیں کی تحریر و تقریر عوام میں احساس پستی پیدا کر کے انھیں انتقام پر آمادہ کر دیتی ہے اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ ایسے لوگ عموماً دو قسم کے جذبہ سے متاثر رہتے ہیں۔ ایک تو محض انسانیت کی خدمت کا خیال یعنی عوام کی پستی کو دور کرنے کی کوشش اور دوسرا خود غرضانہ یعنی اپنے مفاد کے لئے عوام میں جوش پیدا کرنا اور اقتدار حاصل کر لینا، لیکن سنجیدہ نگاہی یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ دونوں اپنے مقصد سے منزلوں دور رہ جاتے ہیں۔ انقلابی تو عوام کے درد کا درماں کر پاتے ہیں اور نہ خود اپنے اقتدار کی محافظت کر سکتے ہیں۔ اول الذکر کی ناکامی کا سبب تو یہی ہے کہ تخریب سے تعمیر کا کام نہیں لیا جاسکتا اور وقتی جوش و دلولہ سنجیدہ و مفکرانہ اقدام کے مترادف

نہیں قرار دے جاسکتے۔ انقلاب فرانس کے واقعات اس پر شہادت دے رہے ہیں کہ عوام کس بری طرح ناکام رہے اور ملک کو ان کی بے راہ روی کی بدولت کن مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن سب سے بڑی ناکامی اُسی جماعت کو ہوتی ہے جو اپنے اقتدار کے لئے عوام سے آلہ کار کا کام لینا چاہتے ہیں۔ ابتدا میں تو یہ اس میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن وہی حربہ جو یہ اپنے پیش رو کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ بہت جلد اس کے خلاف بھی اُٹھایا جاتا ہے اور جس طرح عوام کو درغلا کر یہ اپنے دشمنوں کو بچا دکھاتی ہے۔ اس کے مخالفین بھی اُسی طرح (Class Struggle) کے نعرے لگا کر اور اسے رجعت پسندی کا خطاب دیکر خود ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ کیونکہ ایک دفعہ عوام کا شر و فساد اور بغاوت و بد امنی کی طرف بایں ہو جانے کے بعد احترام قانون اور امن و آشتی کی طرف معاً رغب ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔ عوام کے مطالبات خصوصاً اُس وقت جبکہ ایک غیر مطمئن جماعت انھیں اُبھارتی رہے لائقنا ہی حد تک طویل ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھ لینا کہ جس جماعت نے انھیں اُبھارا تھا۔ ان کے دبا دینے پر بھی قادر ہوگی۔ سخت غلطی ہے۔ انقلاب کی چنگاری جب ایک دفعہ بھڑک اُٹھتی ہے تو دم بہ دم اس کی آگ بڑھتی ہی جاتی ہے اور اُس وقت تک سر نہ نہیں پڑتی جب تک کہ ملک کے سامنے اس سے بھی جھیب تر کوئی دوسری آفت نہ آکھڑی ہو، یا خود عوام میں انتہائی قتل و غارت کے بعد اس کا فطری رد عمل شروع نہ ہو جائے۔ غرض یہ کہ انقلاب کی لیڈر شپ بڑی تیزی سے تبدیل ہوتی رہتی ہے اور ہر انتہا پسند جماعت کے بعد ایک انتہا پسند تر جماعت برسرِ اقتدار ہوتی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس انتہا پسندی اور رجعت پسندی کے درمیان کوئی حد فاصل متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کا انحصار محض اُسی جماعت پر ہوتا ہے جو غیر مطمئن رہا کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ مطمئن اور غیر مطمئن طبقہ کی تفریق تمام و کمال اضافی ہے، جس کی انتہا کبھی ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ اسی طرح اپنے دوسرے مقصد میں بھی انقلاب ناکام میاب رہتا ہے اور انقلابی اپنے اقتدار تک کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ ممکن ہے کہ جواب میں یہ کہا جائے کہ روس میں تو اب تک انقلابی برسرِ اقتدار ہیں، لیکن اہل نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ لیٹن اور اس کے حواریں نے زار اور اس کی حکومت کا خاتمہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ انھوں نے تو اُس جماعت کو تینے کیا جس نے سرزمین روس سے زاریت کا خاتمہ کیا تھا۔

گلاب چاند

(نگار) میں گلاب چاند صاحب کے اس مقالہ کے جواب میں کوئی بسیط گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا ”انقلاب“ کی تحریکیں انفرادی حیثیت رکھتی ہیں یا اجتماعی۔ اگر انفرادی نہیں ہے تو یقیناً اس کی بنیاد صرف جذباتی اصلاح یا طلبِ برادری کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ اب رہا یہ امر کہ اس تحریک کی قیادت کرنے والے غلطی یا خود غرضی میں مبتلا ہو جائیں، سو اس سے اصل تحریک کا نقص ثابت نہیں ہو سکتا۔ علاوہ اسکے ایک بات اور دیکھنے کی ہے، وہ یہ کہ انقلاب کا سبب زیادہ تر اقتصادی عدم توازن ہوا کرتا ہے اور اس کو دور کرنا آسان کام نہیں۔ ہزار ہا سال کے جذبہ ملکیت و سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے بھی کم از کم سیکڑوں برس درکار ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کو شش ماہ میں غلطیاں بھی ہوگی، خود غرض لوگ اس سے نا جائز فائدہ اُٹھانے کی بھی کوشش کریں گے۔ خدا جانے کتنی مرتبہ صورتیں بن بن کر گزریں گی، لیکن اس پر وجہ زور کو دیکھ کر یہ حکم لگانا کہ ”انقلاب“ کی تحریک ہی بجائے خود غلط ہے، صحیح نہیں۔

راجہ منشی

اس اقتصادی کشمکش، اس سیاسی الجھن اور اس علمی و انتہادی خشکی کے دور میں بعض وقت کتابچی چاہتا ہے کہ کاشکے کبھی کبھی چند گھڑیاں اس زمانہ کی بھی میسر آجایا کریں جب انسان ”روڑھا“ نہ ہوا تھا اور ہر چیز کا مطالعہ طفلانہ سادگی سے کیا کرتا تھا۔ وہ پانی کی صرف پانی سمجھ کر اس سے کھیتا تھا اور اس فکر میں مبتلا تھا کہ اس میں آکسیجن کی مقدار کتنی ہے اور ہائیڈروجن کی کتنی، وہ پھول کو محض پھول جان کر اس سے سرور حاصل کرتا تھا اور اسے مطلق خبر نہ تھی کہ رات کے وقت اس کی خوبصورت شکلوں سے زہریلی گیس بھی نکلتی ہے۔ وہ چاند کی صرف ٹھنڈک سے لطف اٹھاتا تھا اور یہ منحوس بات اس کے ذہن میں نہ آئی تھی کہ یہ ایک مردہ کمرہ ہے۔

آج ہمارے فسانوں میں انتقاد و علمیت ہے، نفسیات و سیاست ہے، طبیعیات و ریاضی ہے، اور خدا جانے کیا کیا اسی طرح کی بہت سی ثقیل چیزیں موجود ہیں، لیکن اُس ”معصومیت“ کا تہ نہیں جو ہماری کہانیوں میں پائی جاتی تھی۔ آپ بھی میری طرح شاید گھبرا اٹھے ہوں گے اس لئے آئیے ہم آپ دونوں تھوڑی دیر کے لئے اس ”مشین و عقل“ کی دنیا کو چھوڑ کر پھر اس عالم کی سیر کریں، جہاں فقیہ کی دُعا سے بادشاہوں کے اولاد ہو جایا کرتی تھی اور جہاں شاہزادے ہمیشہ چوتھا ممنوع راستہ اختیار کر کے پریوں کی بستی میں پہنچ جایا کرتے تھے۔

ہمارے عزیز دوست حیات اللہ انصاری کو خدا خوش رکھے کہ ان کی وساطت سے کبھی کبھی یہ بھولی ہوئی دنیا پھر یاد آجاتی ہے۔

گہے طفلے شود مستانہ می رقص !

نیاز

سات دریا پار ایک ناگ دس تھا جہاں کے بسنے والے رات کو کام کاج کرتے اور دن کو سوتے تھے۔ یہاں ناگ راجہ راج کرتا تھا۔ اس کا حکم سمندر کے گھڑیاؤں جنگل کے شیروں اور آسمان کی چڑیوں پر بھی چلتا تھا۔ اس کے پاس دیوتاؤں کا دریا سب کچھ تھا۔ ایک نہیں تھا تو لڑکا ہی نہیں تھا جو اس کے بعد اس کا نام زندہ رکھتا اور اُس کے راج کا مالک بنتا۔ راجہ اس کے کارن ہر وقت اُداس رہتا اور سادھوؤں اور پیراگیوں کی سیوا میں لگا رہتا۔ ایک بار اس کی سیوا سے خوش ہو کر ایک سادھو نے دعا دی کہ ”جا، نو مہینے کے بعد تیری رانی کے ایسا سند پتر ہوگا جسے دیکھے چند زمان شرا جائے اور پریاں بل بل جائیں“

سادھو کا کہنا پورا ہوا اور نویں جینے رانی ایسا لڑکا جنی جو خوبصورتی میں چاند کا ٹکڑا اور میرے کی صورت معلوم ہوتا تھا خبر سنتے ہی راجہ نے خزانوں کا منہ کھول دیا اور اتنا سونا چاندی لٹا دیا کہ رعایا میں کوئی غریب نہیں رہا۔

راجہ نے اس کا نام راجکمار بنی رکھا اور اس کے رہنے کو ایک گنگا جمنی محل بنوایا جہاں روشنی کو میرے اور لال کے چاند سورج جڑا ہے اس میں ایک باغ لگوا یا جس میں ساری دنیا کے سدا پھل اور سدا بہار درخت تھے۔ پھر ہر دس کے سدر سے سدر لوتھی غلام منگوا کے وہاں رکھے اور ان کو حکم دیا کہ خبردار میرے راجکمار کی کسی بات پر نہیں نہ ہو۔ راجکمار اس محل میں اس طرح پردان چڑھا جیسے کلی کی گود میں پھول یا سیسی کے سینے میں موتی پردان چڑھتا ہے۔ راجکمار جب دس برس کا ہوا تو وہ ایسا سندر نکلا کہ جہاں جاتا وہاں اُجالا ہو جاتا اس کی سدر آنکھوں سے میرے کی ایسی جوت نکلتی اور چہرے سے سورج کی ایسی کرنیں پھوٹتی تھیں۔

راجکمار بنی کی کسی بات پر نہیں نہ ہوتی۔ اس کی آنکھ کے ایک اشارے پر آسمان سے تارے اور سمندر کی تہ سے موتی آسکتے تھے گریس پر بھی راجکمار اُداس اُداس رہتا تھا اور باغ میں ایک ہرنگھار کے درخت کے نیچے دن دن بھر چپ بیٹھا رہتا تھا۔ راجہ کو اس کی بڑی فکر تھی مگر وہ کسی طرح راجکمار کو خوش نہ کر سکا۔

ایک دن کا قصہ ہے کہ راجکمار بنی شکار کھیلتے کھینٹے اپنے ساتھیوں سے بچھا گیا اور ایک گاؤں کے پاس ٹھہر کر ان کے آنے کی راہ دیکھنے لگا۔ اتنے میں گھٹا گھر آئی اور پیٹ پیٹ کر پانی برسنے لگا۔ راجکمار گھوڑے کو درخت کے نیچے باندھ کر آپ ایک جھونپڑے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس جھونپڑی میں رہتا تھا ایک چڑیا۔ جس وقت راجکمار اس کی جھونپڑی کے پاس کھڑا تھا اُس نے اندر اپنی بیوی سے کوئی کام کو کہلایوی نے کہا میں نہیں کر دوں گی۔ اس پر چڑیا نے اُس کو برا بھلا کہا بیوی نے بھی غصہ میں آکر برابر کا جواب دیا اور دیر تک دونوں میں جھگڑا ہوتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں چڑیا کی بیوی اپنا قصہ سمجھ گئی اور اُس نے اپنے شوہر سے معافی مانگ لی دونوں گلے گلے اور خوشی خوشی باتیں کرنے لگے۔ راجکمار بھی ان کی خوشی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

اس وقت راجکمار کے ساتھی اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے آ پہنچے تھے اور یہ دیکھ کر کہ راجکمار کچھ باتیں سن رہا ہے ہاتھ باندھ کر الگ کھڑے ہو گئے۔ راجکمار نے ان میں سے ایک کو پاس بلایا اور اُس سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھی نے ادب سے ہاتھ باندھ کر کہا:

”ہمارا ج، یہ لوگ چڑیا رہیں اور آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں“

راجکمار نے آج تک ”جھگڑنے“ کا لفظ ہی نہیں سنا تھا۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ میں اتنا بڑا ہو گیا اور آج تک نہ کسی سے جھگڑا کیا اور نہ ملاپ کر کے چڑیا کی طرح خوش ہوا۔ اب اس کے دل میں یہ سودا سہا یا کہ ہم بھی کسی سے کوئی بات کہتے اور چڑیاوں کی طرح وہ بھی اس کے کرنے سے انکار کر دیتا۔ پھر ہم بڑھتے اور وہ بھی بڑھتا اور دونوں خوب جھگڑتے۔ پھر

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ملاپ کر لیتے اور چڑیا اور چڑیا رن کی طرح خوش ہوتے۔ راجکمار کو اس کی لگن ایسی لگی کہ اسے محل پہنچتے ہی اپنے سب سے زیادہ سیوا کرنے والے نوکر کو بلایا جب وہ آیا تو اس سے کہا:

”جو میں کہوں وہ تو کرے گا۔“

اُس نے پاؤں چھو کر جواب دیا:

”اگر آپ کی آگیا ہو کہ میں اپنے ہاتھ سے اپنا سر کاٹ ڈالوں تو میں اپنا سر کاٹ ڈالوں گا۔“ راجہ جی باتیں روز سنتا رہتا تھا۔ اس نے ادھر دھیان بھی نہیں دیا اور کہا ”اچھا، تم ہم سے جھگڑا کرو۔“

یہ سنتے ہی وہ کانپ گیا اور ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑا کر کہنے لگا۔ ”مہاراج آپ کے غلاموں کی کیا مجال کہ وہ اس کا خیال بھی جی میں لائیں۔“

راج کمار نے اس کی بہت خوشامدی کی مگر وہ ہاتھ باندھے گردن جھکائے بلامنہ سے ایک لفظ نکالے چپ کھڑا رہا۔ پھر راجکمار نے اس کو بہت ڈانٹا تب اس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو گرنے لگے مگر اسکی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ راجکمار نے بگڑ کر اس کو اپنے کمرے سے نکال دیا اور پھر ایک دوسرے نوکر کو بلایا جو راجکمار کے اشارے پر کٹھپلی کی طرح چلتا تھا جب وہ آیا تو اُس سے کہا:

”جو میں کہوں وہ تو کرے گا۔“

اُس نے ادب سے پاؤں چھو کر جواب دیا:

”اگر مہاراج کی آگیا ہو کہ میں آگ میں کود پڑوں تو میں کود پڑوں گا۔“

راجکمار ایسی باتیں ہر وقت سنا کرتا تھا اُس نے ادھر دھیان بھی نہیں دیا اور کہنے لگا: ”ہم سے کسی بات پر جھگڑا کرو۔“

یہ حکم سنتے ہی وہ تھر تھرا کا پٹنے لگا اور رونے لگا۔ پھر گڑ گڑا کر بولا:

”مہاراج آپ کے اس غلام سے کیا قصور ہوا ہے جو اس کو ایسی آگیاں ملی ہے۔“

راجکمار نے منت کی اور جب نہ مانا تو اُس کو ڈانٹا ڈپٹا و فادار نوکر ہاتھ باندھے چپ چاپ کھڑا رہا راجکمار نے غصے میں آکر اُس کو اپنے سامنے سے دور کیا اور ایک اور نوکر کو بلایا پھر اس سے پوچھا تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا جہاں مہاراج کا پسینہ گرے وہاں میں اپنا خون بہا دوں راجکمار نے کہا:

”اچھا آؤ ہم تم جھگڑیں۔“

یہ سنتے ہی وہ پُرانی دیوار کی طرح زمین پر گر پڑا اور کہنے لگا:

”میری ایسی مجال کہاں۔“ راجکمار نے ایک ایک کمرے اپنی سب داسیاں بلائیں لیکن ایک نے بھی اسکی یہ آگیاں پوری نہ کی۔ اب راجکمار اتنا اُداس رہتا کہ نہ باغ جاتا اور نہ کھانا کھاتا، دن بھر سر جھکائے بیٹھا رہتا راجہ نے اس کا

دل بہلانے کے لئے مسخرے بھیجے کوئی مور کی طرح ناچتا تو کوئی کوتے کی طرح پھدکتا کوئی شیر کی طرح گرجتا تو کوئی مرغ کی طرح لگڑوں کوں کرتا یہ سب آئے اور اپنے کرتب دکھاتے رہے مگر راجکمار اسی طرح اُداس اپنے خیالوں میں کھویا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا زندگی ہے کہ جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں ملتا ہے اور جو میں نہیں چاہتا ہوں وہ ملتا ہے، ایک دن راجکمار کو کچھ خیال آیا اور اس نے دو چوہدار بھیج کر چڑیا اور چڑیا رن کو بلا بھیجا۔ جب وہ دونوں آئے اور راجکمار کے سامنے کھڑے ہوئے تو ان کی گھلکی بندھی ہوئی تھی اور چہرے دھلے کپڑوں کی طرح سفید تھے۔ کیونکہ انھوں نے زندگی بھر نہ راج محل کو دیکھا تھا نہ کبھی راجکمار کو۔

راجکمار نے ان کی ڈھارس بندھائی اور کہا اگر تم میرا ایک حکم مانو تو میں تمہیں اتنا سونا چاندی دوں گا جو تمہاری سات پشتوں تک چلے۔ چڑیا نے خوش ہو کر پوچھا ہمارا راج کی کیا آگیاں ہے۔ راجکمار نے کہا جیسے تم آپس میں جھگڑتے ہو ویسے ہی تم مجھ سے بھی جھگڑو۔

چڑیا نے کہا کہیں پر جا راجاؤں سے جھگڑ سکتی ہے۔

یہ سن کر راجہ منی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ سمجھ گیا کہ راجکمار بن کر میں اپنی خواہش نہیں پوری کر سکتا۔ اب راجکمار کا یہ شوق اتنا تیز ہو گیا کہ اُس نے طے کر لیا کہ چاہے جو ہو میں اسے پورا کر کے رہوں گا۔ چاہے مجھے اسکے کارن اپنا دیس اور راج پاٹ ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔

اسی دن آدھی رات رہے جب سارے محل میں سوتا پڑا تھا راجکمار ایک سپاہی کا بھیس بدل کر باہر نکلا۔ اور اپنے ہاتھ سے گھوڑے پر زین کس راتی رات کسی دور دراز کے دیس کو چل کھڑا ہوا۔

چلتے چلتے ایک شہر میں پہونچا جہاں کے بازاروں میں ایسی چیل پیل تھی اور لوگ ایسے ملنسار تھے کہ اسکا جی چاہا کہ یہیں رہ جاؤں اُس نے ایک اچھا سا مکان خریدا۔ اور وہاں ایک سوداگر بن کر رہنے لگا۔

پڑوس میں ایک کسان رہتا تھا جس کی ایک لڑکی تھی جس کا نام کنول تھا جو مور کی طرح ایلی اور ناگن کی ایسی چیل تھی۔ ایک دن وہ اپنے کوٹھے پر آئی تو دیکھتی کیا ہے اس کے پڑوس والا مکان جہاں پہلے دن کو چگا ڈڑا اور رات کو بھوت رہتے تھے اب آدمیوں سے بسا معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے اچک کر جھانکا تو دیکھتی کیا ہے کہ کمرے میں پردے پڑے ہوئے ہیں۔

اُس نے کہا اہا اہا یہاں تو ریشمی پردے پڑے ہوئے ہیں اور یہ کہہ کر اس طرف کو دگنی اور چپکے چپکے جا کر پردہ اٹھا کر اندر جھانکا تو دیکھتی کیا ہے کہ کوئی چادر تانے بے خبر سو رہا ہے اور اس کے پاس چوکی پر ایک کٹورے میں پانی بھرا رکھا ہے اور ایک تھالی میں پان پھول اور عطر رکھے ہیں۔ یہ دیکھ پاؤں اندر گئی اس نے کٹورے کا آدھا پانی پی لیا تھالی کے آدھے پان کھائے، شیشی کا آدھا عطر لگا لیا اور آدھے پھول ہاتھ میں لے کر اپنے گھر چلی آئی۔

سورج ڈوبنے پر راجہ بنی کی آنکھ کھلی تو دیکھتا کیا ہے کہ کوئی کنول کے کٹورے کا آدھا پانی پی گیا ہے تھالی کے آدھے پان کھا گیا ہے شیشی کا آدھا عطر لگا گیا ہے اور آدھے پھول لے گیا۔ راجہ بنی کی زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی اس طرح چوری چھپے آیا ہو اور اس کی چیزوں کو بگاڑ گیا ہو۔ اُس نے بچا ہوا پانی پیا اور بچے ہوئے پان کھائے بچا ہوا عطر لگایا اور بچے ہوئے پھول سوگئے تو اس کو ان میں ایسا مزہ ملا جیسا آج تک ان چیزوں میں نہیں ملا تھا۔

دوسرے دن بھر وہی ہوا کہ کنول آئی اور آدھا پانی پی گئی آدھے پان کھائے آدھا عطر لگایا اور آدھے پھول ساتھ لے اور لوٹنے لگی تو اُس نے دیکھا کہ سونے والے کا ہاتھ نیٹ سے لٹک رہا ہے اور اُس کی انگلی پر ایک انگوٹھی چمک رہی ہے کنول نے اپنی انگلی کی انگوٹھی اتار کر اُس کو پہنا دی اور اُس کی انگوٹھی خود پہن کر چلتی بنی۔ جب سورج ڈوبا اور راجہ بنی کی آنکھ کھلی تو دیکھا آدھا پانی آدھے پان آدھا عطر اور آدھے پھول تو غائب ہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ آج ہاتھ کی انگوٹھی بھی بدلی ہوئی ہے۔

راجہ بنی نے سوچا کہ کچھ ہوا اس چور کو ضرور پکڑنا چاہئے دوسرے دن جب سورج نکلنا اور راجہ بنی کی آنکھوں میں میند بھرنے لگی تو اُس نے تلوار سے اپنی چھنگلیا کاٹ کر اس میں نمک مرچ بھر لیا کہ اس تکلیف سے میند نہ آئے اور چادران کے سوتا بن گیا۔ جب دوپہر ہوئی تو دیکھتا کیا ہے کہ ایک لڑکی پری کی ایسی پھرتیلی مور کی ایسی ابیلی اور ناگن کی ایسی چنچل چلی آرہی ہے۔

اس کے ہونٹ ایسے لال تھے جیسے طوطے کی چوہنچ اور آنکھیں ایسی بڑی بڑی تھیں جیسے کنول کے کٹورے وہ بتی کی طرح دبے پاؤں اندر آئی۔ اس نے چپکے سے آدھا پانی پیا، آدھے پان کھائے، آدھا عطر لگایا اور پھر اس کے سر ہانے سے آدھے پھول اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ راجہ بنی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کنول نے ایک جھٹکا دیکر ہاتھ چھڑا لیا اور کو دکر الگ کھڑی ہو گئی۔ راجہ بنی کو اس پر بڑی حیرت ہوئی۔ آج تک اس کے ساتھ کسی نے ایسا نہیں کیا تھا۔ راجہ بنی نے ذرا سختی سے کہا ”میں تم کو آگیاں دیتا ہوں کہ ادھر آؤ“

کنول: ”یہ سنکر بگڑ گئی اور کہنے لگی: ”مجھ پر کسی کا حکم نہیں چل سکتا“

اس کا بگڑنا تھا کہ راجہ بنی پر چھائی ہوئی گھٹا چھٹ گئی اور اندر خوشی کی بہریں اٹھنے لگیں۔ اس نے منتیاں کر کے کنول کو روکا اور اسی دن سے کنول اس کی بیوی ہو گئی۔

راجہ بنی کے ہاں باپ راجہ بنی کے کھوجانے سے بہت پریشان تھے ان کی بھوک پیاس جاتی رہی تھی اور دن رات ان کا یہی کام تھا کہ اپنے لڑکے کو یاد دکر کر کے آٹھ آٹھ آنسو رو دیا کرتے تھے۔ بڑے بڑے پنڈت اور جوتشی بلائے گئے

اور ان کو راجکمار کی کنڈلی دکھائی گئی اور بہت پوجا پاٹ کیا گیا۔

راجکمار کی ماں نے کچھ اور سوچا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا۔ ہونہو راجکمار کسی خوبصورت لڑکی کے پھیر میں غائب ہوا ہے اور اس نے اپنے چکر میں اس کو ایسا پھنسا رکھا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے راج پاٹ کو بھلائے بیٹھا ہے۔ یہ سوچ کر مہارانی نے بڑی بڑی کٹنیاں بلائیں اور اُن سے پوچھا تم کیا کام کر سکتی ہو؟ ایک بولی ”میں آسمان میں چلتی لگا سکتی ہوں۔“

دوسری نے کہا ”میں اُڑتی چڑیا کے پر گن سکتی ہوں۔“

تیسری نے کہا ”میں سیپی کے پیٹ سے موتی چرا کر لاسکتی ہوں۔“

چوتھ سے بڑھی تھی چلا کر بولی ”میں پرانی پہو بیٹیوں کو بھلا پھسلا کر لاسکتی ہوں۔“

رانی نے جو تھی کٹنی کو بہت پسند کیا اور اس کو اپنے راجکمار کی سچان بتائی اور وہ پیسہ دیکر راجکمار کی کھوج میں بھیج دیا۔ بڑھیا شہر شہر گاؤں گاؤں، محلوں محلوں، جھونپڑوں جھونپڑوں، راجکمار کی کھوج میں گھومنی گھومی پھری۔ چوہے کی طرح بڑے سے بڑے محل میں گھس جاتی۔ چرندوں کی طرح اونچے سے اونچے قلعے میں پہنچ جاتی اور شہد کی مکھیوں کی طرح باغوں میں گھومتی آخر گھومتے گھومتے وہ اس دیس میں آئی جہاں راجکمار رہتا تھا اس نے ایک ایک کر کے سب گھر دیکھ ڈالے لیکن راجکمار کا گھر نہ مل سکا۔ یہ کیونکہ وہ صرف رات کو کھلتا تھا۔ بڑھیا نے جب بھی اس کو دیکھا اندر سے بند پایا۔ اس نے سوچا کہ کیسے لوگ ہیں جو گھر میں ایسے رہتے ہیں جیسے کوئی جیل خانے میں۔ اس نے پاس پڑوس والوں سے پوچھا کہ یہاں کون رہتا ہے لوگوں نے کہا یہاں ایک سوداگر بچہ رہتا ہے جو صرف رات کو باہر نکلتا ہے۔ یہ سن کر بڑھیا کھٹکی اور سوچی کہ ہونہو یہی راجکمار ہے۔

جب رات ہونے لگی تو بڑھیا ایک بھکارن بن کر دروازے کے سامنے بیٹھ رہی، رات گئے جب راجکمار باہر نکلا اور بڑھیا نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تو پوری وہی صورت پائی جیسی مہارانی نے بتائی تھی۔ بڑھیا دیکھ کر خوش ہو گئی۔ دوسرے دن اس نے چوڑی والی کا بھیس بنایا اور رنگ برنگی چوڑیاں ایک ٹوکری میں رکھ کر راجکمار کے گھر کی طرف آئی۔ جب رات ہوئی اور راجکمار باہر چلا گیا تب اُس نے دروازے کے سامنے آکر آواز لگائی۔

”لے چوڑی۔ لے رنگ برنگی چوڑی۔ لے سنہری روپلی چوڑی۔“

کنول کو راجکمار کے گھر میں رہتے ہیمنوں بیت گئے تھے۔ لیکن اس کے دروازے پر کبھی کوئی سودا بیچنے نہیں آیا تھا کیونکہ رات کو جب یہ لوگ جاگتے تھے تو سودے والے اپنے اپنے گھر جا کر سو رہتے تھے۔ اس وقت کنول نے جیسے ہی چوڑی والی کی آواز سنی وہ دوڑی ہوئی دروازے کے پاس آئی اور چوڑی والی کو بلا کر اندر لے گئی اور جھٹ سے چوڑی پہننے کے لئے اپنے ہاتھ کو بڑھیا کے سامنے بڑھا دیا۔ بڑھیا نے دیکھا کنول کا ہاتھ سونے کی طرح ہلکا چوڑی

کے ہے تب تو وہ ہاتھوں کو دیکھ کر ہنکاری اور کہنے لگی کہ تمہارے میاں تم کو بالکل نہیں چاہتے۔

کنول نے کہا: ”واہ واہ وہ تو ہم سے بہت پریم کرتے ہیں۔“

بڑھیا نے کہا میں نہیں مانتی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے میاں تمہارا جھوٹا کھانا کھاتے ہیں اور جھوٹا پانی پیتے ہیں؟

کنول نے کہا ”نہیں، ان کی تھالی اور کٹورا الگ رہتا ہے اور میرا الگ رہتا ہے۔“

بڑھیا بولی: ”واہ بچی کہاں پریم کرتے ہیں؟ تب جانوں کہ تم سے پریم کرتے ہیں کہ آج تم ان کا جھوٹا کھاؤ اور وہ

تمہارا جھوٹا کھائیں۔ کنول نے کہا ”یہ بھی کوئی بڑی بات ہے؟ آج ہی اپنے میاں سے کہوں گی۔“

اس دن جب راجکمار اور کنول کھانا کھانے بیٹھے تو کنول نے کہا کہ آؤ آج ہم تمہارا جھوٹا پانی پیئیں اور تم ہمارا جھوٹا

پانی پیو، یہ سنتے ہی راجکمار کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا: ”کنول آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا یہاں کوئی

آیا تھا اور اُس نے تم کو کچھ سکھایا پڑھایا ہے؟“ کنول نے سمجھا کہ راجکمار اس طرح بات ٹالنا چاہتا ہے۔ اُس نے

جھٹ پٹ کہا۔ نہیں کوئی نہیں آیا تھا۔ یہ میں خود سے چاہتی ہوں۔ ”راجکمار نے اُسے سمجھایا کہ یہ نہ کرو لیکن اس سے

جھگڑا نہیں ختم ہوا تب راجکمار نے اپنا کٹورا اٹھا کر اپنے منہ سے لگایا اور اس طرح جھوٹ موٹ کے گھونٹ پئے جیسے

پانی پی رہا ہو لیکن اس نے پانی نہیں پیا۔ پھر وہ کٹورا کنول کو دیا اور اس کے کٹورے کا پانی خود پی لیا۔ کنول خوش ہو گئی۔

بڑھیا اپنے جی میں خوش تھی کہ کنول نے راجکمار کے منہ کا جھوٹا پانی پی کر جان دیدی ہوگی۔ لیکن جب وہ دوسری رات

کو سرمہ مستی لے راجکمار کے گھر آئی تو دیکھتی کیا ہے کہ کنول جیتی جاگتی بیٹھی ہے اور اُسے دیکھتے ہی تالی بجا کر کہنے لگی کہ دیکھو میں

کہتی تھی کہ میرے میاں مجھے چاہتے ہیں۔ کل میں نے ان کا جھوٹا پانی پیا اور اس نے میرا جھوٹا پانی پیا۔

بڑھیا نے کہا: ”واہ یہ تو چھوٹی سی بات تھی۔ تب جانوں کہ تمہارے میاں تم کو چاہتے ہیں کہ تم ان کے منہ کا

اگال کھاؤ اور وہ تمہارا اگال کھائیں۔“

کنول نے کہا: ”اچھا۔ آج یہی ہوگا۔“

بڑھیا چلی گئی اور اس دن جب راجکمار آیا اور کھانا پینا ہو چکا تب دونوں پان کھا کر باتیں کرنے لگے دیے ہی کنول

نے کہا ”تب جانوں کہ تم مجھ کو چاہتے ہو کہ تم میرا اگال کھاؤ اور میں تمہارا اگال کھاؤں۔“

اب تو راجکمار یہ سنگرم برچکر میں پڑا کہ یہ بات کیا ہے۔ کوئی نہ کوئی کنول کو سکھاتا پڑھاتا ضرور ہے۔ اس نے کنول سے

پوچھا کہ سچ سچ بتاؤ کہ یہ باتیں کون بتاتا ہے۔

کنول نے اپنے دل میں کہا کہ میرا میاں مجھے ٹالنا چاہتا ہے اُس نے کہا: ”یہاں رات کو مجھے کون سکھانے پڑھانے

آئے گا۔ یہاں رات کو صرف چوہے بلی آتے ہیں۔ ان کے سکھانے سے کوئی سیکھ لے تو سیکھ لے۔ راجکمار نے بہت سمجھایا

لیکن کسی طرح وہ نہ مانی۔

آخر راجکمار نے اپنا اگال اپنے ہاتھ میں لیا اور کنول سے کہا کہ لاؤ اپنا اگال دو جب کنول نے اپنا اگال دیا تو اُسے وہ بھی اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر اپنا اگال آپ کھا لیا اور اس کا اگال اُس کو دیدیا گیا۔ کنول سمجھی کہ اس نے ہماری بات مان لی اور خوش ہو گئی۔

دوسرے دن جب بڑھیا آئی اور اُس نے دیکھا کہ کنول صبحی جاگتی بیٹھی ہوئی ہے تو بہت گھبرائی کہ یہ کیا بات ہے کنول اس کو دیکھتے ہی ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ میں کہتی نہ تھی کہ میرے میاں مجھ کو چاہتے ہیں۔ کل ہم نے ان کا اگال کھایا اور اُنھوں نے میرا اگال کھایا۔

بڑھیا نے کہا ”واہ یہ تو چھوٹی سی بات تھی تب جانوں کہ تمھارے میاں تم کو چاہتے ہیں کہ وہ تم کو اپنی ذات بتا دیں“ بڑھیا چلی گئی۔ رات کو جب کھانا دانا کھا کر راجکمار اور کنول بیٹھ کر باتیں کرنے لگے تو کنول نے پوچھا کہ تمھاری ذات کیا ہے۔

یہ سنتے ہی راجکمار اُچھل پڑا اور بگڑ کر کہنے لگا دیکھو ایسی باتیں نہ کرو۔ نہیں تو ہم تم بچھڑ جائیں گے۔ کنول نے کہا: ”میں یہ کچھ نہیں سنتی۔ تم مجھے اپنی ذات بتاؤ“

راجکمار نے اس کی منتی کی گڑ گڑایا۔ مگر کنول نے ایک نہ سنی۔ نہ ماننا تھا نہ مانی اور وہی رٹ لگاتی رہی کہ مجھے اپنی ذات بتاؤ، مجھے اپنی ذات بتاؤ۔

ایک دن سے دوسرا دن ہوا، کنول اٹوار کھٹوار لیکر بھوک پیاسی ایک کونے میں پڑی رہی راجکمار نے اس کے سمجھانے میں کوئی کسر اٹھانے رکھی بار بار کہا کہ یہ بات تم کو کسی دشمن نے سمجھائی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم تم بچھڑ جائیں مگر کنول کی ایک ہی رٹ تھی کہ مجھے اپنی ذات بتاؤ، مجھے اپنی ذات بتاؤ۔

راجکمار نے اس کے لئے زنگ برنگی کپڑے اور طرح طرح کے زیور خریدے۔ موتیوں کے ہار جس کے موتی لال کے انڈے کے برابر تھے اور یا قوت کے بندے جو طوطے کی زبان کی طرح لال تھے لاکر کنول کے سامنے رکھ دیے۔ مگر وہ نہ ماننا تھی نہ مانی اور برابر یہی رٹ لگائے رہی کہ مجھے اپنی ذات بتاؤ۔ اپنی ذات بتاؤ۔

آخر راجکمار نے کہا میں اپنی ذات اس وقت بتاؤں گا جب میں کمر کمر پانی میں کھڑا ہوں۔ کنول نے کہا چاہے ندی میں کھڑے ہو کر بتاؤ چاہے سمندر میں لیکن مجھے اپنی ذات بتاؤ۔ میں بلا یہ جانے زندہ نہیں رہ سکتی۔“

دوسرے دن ڈولا منگوا لیا گیا۔ اس میں کنول بیٹھی اور گھوڑے پر ساتھ ہوئے راجکمار منشی اور دونوں گھاٹ پر پہنچے۔ یہاں راجکمار نے کہا دیکھ کنول اب بھی مان جا۔ نہیں تو بچھڑ جائے گی کنول بولی میں کچھ نہیں سنتی۔ راجکمار نے یہ سن کر غصہ سے کپڑے اُتارے اور کمر کمر پانی میں اتر گیا۔ پھر کہا اب بھی مان جا۔ نہیں تو میرے تیرے بیچ میں سات سمندر ہوں گے۔ نہ تو وہاں جا سکے گی اور نہ پھر میں آسکوں گا۔ کنول بولی میں یہ کچھ نہیں سنتی، مجھے اپنی ذات بتاؤ۔ راجکمار

ایکی یہ سنتے ہی تھلا گیا۔ اُس نے پانی میں ڈبکی لگائی اور پھر کالا چمکتا ہوا چہرہ اور شعلے کی طرح لپ لپ کرتی زبان دریا سے نکال کر بولا:-

”یہ دیکھ میری ذات۔ یہ دیکھ میری ذات“

پھر پھین اندر کر لیا جہاں راجہ مارنے غوطہ لگایا تھا وہاں چھوٹے چھوٹے گھیرے پانی پر بنے اور دھیرے دھیرے کر کے مٹ گئے۔ راجہ مار غائب ہو کر پھر باہر نہ آیا۔

جب راجہ مار واپس نہ آیا۔ تب کنول کو معلوم ہوا کہ اُس نے کتنی بڑی غلطی کی۔ جیسے سادون بھادوں میں کالی گھٹائیں چھڑی لگا دیتی ہیں ویسے ہی کنول کی آنکھوں سے آنسوؤں کی چھڑی لگ گئی۔ جب روتے روتے اُسے کئی دن بیت گئے تو اُس کے جی میں آیا کہ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔ وہ اٹھ کر دریا کی طرف دوڑی اور کود پڑی۔ دو چار ڈبکیاں کھا کر بے ہوش ہو گئی ایک مچھلی یہ سب لیلہ دیکھ رہی تھی اُسے کنول کی بیچارہ ترس آگیا۔ اُس نے کندھ کو اپنی پیٹھ پر لا کر سات سمندر پار ناگ دہیں پہنچا دیا۔

کنول کی جب آنکھ کھلی تو دیکھتی کیا ہے کہ میں ایک بہت بڑے جنگل میں پڑی ہوں۔ جنگل کے پیڑوں پر پھل پھول تمام ہیں مگر تپتی ایک بھی نہیں اور ڈالیاں سانپ کی طرح بل کھاتی آپس میں لپٹی ہوئی تھیں۔ کنول اٹھ کر ایک طرف چلی۔ چلتے چلتے ایک آبادی کے باہر ایک کنوئیں کے پاس پہنچی۔ جہاں چار پانچ سندر سندر لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ کنول چلتے چلتے تھک کر چور ہو گئی تھی اور اس کا گلا پیاس سے سوکھ کر کاٹا ہو گیا تھا۔ اُس نے جگت کے پاس جا کر ایک لڑکی سے کہا ”بہن مجھے پانی پلا دے۔“ اُس نے کہا ”بٹ تجھے اپنی پڑی ہو آج میرا راجہ مار نہا رہا ہے جو برسوں کے بعد گھر آیا ہے پنڈت جی نے کہا ہے کہ جب تک وہ ایک سو ایک گھڑوں سے نہ نہائے گا ہم لوگوں سے مل جہل نہیں سکتا ہے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ جلدی سے وہ نہائے تو ہم اس سے ملیں چلیں“

کنول کے کان کھڑک ہوئے اُس نے پوچھا تمہارا راجہ مار اتنے دنوں تک کہاں رہا۔ اُس نے جواب دیا:-

”اُسے ایک چالاک عورت نے اپنے جال میں پھانس رکھا تھا۔ اب ایک بڑھیا اُسے چھڑا کر لائی ہے“

کنول نے منتی کی کہ مجھے پانی پلا دو پیاس سے مری جا رہی ہوں۔ آخر ایک پانی والی کو ترس آیا اور اُس نے کہا

”ادھر آ۔۔۔ میں پانی پلا دوں“

کنول نے پانی پینے میں اپنی آنکھوٹھی گھڑے میں ڈال دی پانی بھر کر سب لڑکیاں ایک ایک لگری سر پر اور ایک ایک کمر پر رکھ کے محل کی طرف چلیں۔ محل میں راجہ بنی ایک سونے کی چوکی پر بیٹھا تھا۔ پانی بھرنے والیوں نے اپنے اپنے گھڑے لاکر رکھ دیے اور ایک ایک کر کے راجہ مار کے سر پہ ڈالنے لگیں۔ ایک گھڑے سے آنکھوٹھی نکل کر راجہ مار کی گود میں گری راجہ مار نے اُسے دیکھتے ہی چھپا لیا اور کہا:- ”آخر کب تک آ پہنچی“

نہا دھو کر بنی ٹہلنے کے بہانے محل کے باہر نکلا اور ادھر ادھر کنول کو دیکھنے لگا۔ دیکھا تو وہ ایک درخت سے لگی کھڑی رو رہی ہے اس کے کپڑے میلے ہیں بال اُلجھے ہیں اور پاؤں میں چھالے پڑے ہیں، اس بُری حالت میں دیکھ کر راجہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے انھوں نے پاس جا کر اپنی ہتھیلیوں سے کنول کے آنسو پوچھے۔ آنسو پوچھنے میں کنول کی آنکھوں کا کاجل ہتھیلیوں میں بھر گیا اور اُسے اس کی خبر نہ ہوئی۔

راجہ مارنے کہا دیکھ کنول، آج میں اپنی ماں سے کہوں گا کہ گھر میں جھاڑو دینے کو ایک عورت کو رکھ لو وہ پوچھے گی کون عورت ہے تو میں کہوں گا کہ مصیبت کی ماری کہیں باہر سے آگئی اور یہاں ماری ماری گھوم رہی ہے۔ تب وہ تم کو رکھ لیں گی۔ یہ سن کر کنول کو تھوڑی سی ڈھارس ہوئی اور وہ راجہ مار کے ساتھ ساتھ محل کے پھاٹک تک آئی اندر جا کر راجہ مار نے جو کچھ کنول سے کہا تھا اپنی ماں سے کہا: ماں نے اپنے بیٹے کی خوشی دیکھ کر کنول کو نوکر رکھ لیا۔ لیکن راجہ مار کی بہنوں نے راجہ مار کی ہتھیلیوں میں کاجل بھر دیکھ لیا اور کھٹک گئیں۔ جب دوسرا دن ہوا تو بہنوں نے ایک ڈلیا میں دھان نکالے اور ایک ایک گن کر کنول کو دے دی اور کہا اس کو کوٹ لا کر خبردار ایک چانول نہ ٹوٹے۔

کنول بچاری ڈلیا لے کر باہر آئی اور ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر رونے لگی ادھر سے آنکلی راجہ بنی۔ انھوں نے اسے روتے دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے۔ کنول نے سب حال کہا، یہ سن کر راجہ مار نے جنگل کی چڑیوں کو بلایا اور ان کو حکم دیا کہ سب دھان کھٹک کر چانول باہر نکال دو چڑیوں نے بات کی بات میں کام پورا کر دیا اور کنول خوش خوش چانول کی ٹوکری لے کر ہوئے اندر آئی۔

راجہ مار کی بہنیں یہ دیکھ کر کنول سے کہنے لگیں :-

”یہ تیرا کام نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کس کا کام ہے۔“

دوسرے دن راجہ مار کی بہنوں نے کنول سے کہا دیکھ ہمارے بھتیجا کا بیاہ ہو رہا ہے ان کے رہنے کے لئے وہ سامنے والا کرا جھاڑ بہار کر صاف کر دے۔

کنول جھاڑو لے کرے کی طرف گئی، وہاں دیکھتی کیا ہے کہ چھت میں بڑے بڑے سانپ لٹک رہے ہیں اور بھینکاریں مار مار کر آپس میں لڑ رہی ہیں۔

نیچے بڑے بڑے اجگر بڑے ہوئے ہیں اور کونوں میں بچھو اور کھنکھجورے رینگ رہے ہیں یہ دیکھ کر کنول ڈر کر بھاگ آئی اور ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی ادھر سے آنکلی راجہ بنی انھوں نے جو اسے روتے دیکھا تو پاس آ کر پوچھا کیا بات ہے اُس نے سب قصہ کہہ سنایا۔ انھوں نے اپنی انگوٹھی اتار کر کنول کو دی اور کہا اے جا کر کمرے میں ڈال دو۔

کنول نے ایسا ہی کیا انگوٹھی دیکھتے ہی سب اجگر سانپ بچھو اور کھنکھجورے بلوں میں گھس گئے۔ کنول نے سب جھاڑ بہار کر صاف کیا اور راجہ مار کی بہنوں سے آکر کہا کہ کمرہ صاف ہو گیا ہے۔

راجہ مار کی بہنوں نے جا کر کمرہ دیکھا اسے صاف دیکھ کر حیرت میں آ گئیں پھر کنول سے کہنے لگیں :
”یہ تیرا کام نہیں ہے ہم جانتے ہیں کہ یہ کس کا کام ہے“

ہوتے ہوئے راجہ مار کی برات کا دن آ گیا۔ بیاہ میں ہاتھی گھوڑے شیر اور ریچھ سب ساتھ ساتھ تھے۔ خوب باجے
گاجے تھے اور طرح طرح کی آتشبازیاں تھیں۔ راجہ مار کی بہنوں نے کنول کو بلا کر پوچھا کہ تم راجہ مار کو کتنا چاہتی ہو اُس نے
جواب دیا کہ ان کو اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں، بہنوں نے کہا ہمارے یہاں رواج ہے کہ جو دولہا کو بہت چاہتا ہے
اس کے ہاتھ کی دسوں انگلیوں میں کپڑا لپیٹ کر تیل چھڑک دیتے ہیں پھر اس میں آگ لگا کر مشعلیوں کے ساتھ ساتھ
دولہا کے گھوڑے کے آگے آگے رکھتے ہیں۔

بھولی کنول اس پر راضی ہو گئی اس کے ہاتھ کی دسوں انگلیوں پر کپڑا لپیٹا گیا۔ پھر اُن پر گھی چھڑکا گیا اور ان میں
آگ لگا دی گئی اور اُسے راجہ مار کے گھوڑے کے آگے کر دیا گیا جب برات چلی تو یہ بھی چلی۔ اتفاق سے اس کی انگلیوں سے
اس کی ساڑھی میں آگ لگ گئی۔ اُسے دیکھ کر کسی نے کہا :

”مشعل چن۔ دیکھ تیرے کپڑے جل رہے ہیں“

کنول اپنے دکھ میں ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ اُس نے سنا بھی نہیں پھر کسی نے کہا :

”مشعل چن دیکھ تیرے کپڑے جل رہے ہیں“

اب کنول چونکی اور چونک کر بولی :

”کپڑے کیا یہاں تن میں سب جل رہا ہے“ اس کی آواز سن کر راجہ مار چونک پڑا اور گھوم کر اس کی طرف دیکھا
تو دیکھتا کیا ہے کہ کنول کی دسوں انگلیاں مشعل بنی ہوئی ہیں اور اس کے بدن میں بھی آگ لگ چکی ہے۔

راجہ مار نے جب کنول کو اس بری حالت میں دیکھا تو اس سے نہ رہا گیا اس نے ایک پھنکار ماری جس سے برات
کے سارے چراغ مشعلیں اور بتیاں بجھ گئیں اور اندھیرا گھپ ہو گیا اُس نے کنول کی ہانہ پکڑ کر اپنے گھوڑے پر بٹھالیا
اور گھوڑے کو بھگاتا ہوا اپنے دیس سے نکل گیا۔ دیس کے باہر پہنچ کر اُس نے اپنے بال کاٹ ڈالے جس سے اس میں
ناگ بننے کی طاقت نہیں رہی اور وہ معمولی آدمی بن کر کنول کے ساتھ آدمیوں میں رہنے لگا۔

حیات اللہ انصاری

(نیا ادب)

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے
فلسفہ مذہب تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت ۷۰ روپے رعایتی ۱۲ روپے محصول علاوہ۔
منیجر نکار بک کھنسی لکھنؤ

اخبار کینی کے عہد حکومت میں

ہر ملک کی حیات ملی و قومی میں اخبارات ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، ہمارا وطن بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے اگرچہ ہندوستانی اخبارات یہاں کی رائے عامہ کے اتنے پرزور ترجمان نہیں ہیں جتنا مغرب کے یورپ میں اخبارات اٹھارویں صدی کے آغاز ہی میں بہت زور پکڑ چکے تھے اور ان کی بڑی وقعت تھی اسی بنا پر نیپولین کہا کرتا تھا کہ ”چار مخالف اخبار ایک لاکھ نیروں سے زیادہ خطرناک ہیں“۔ ہندوستان میں ایسے خوفناک حربے کی ابتدا اور نشوونما کی تاریخ کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا لیکن قبل اس کے کہ ہندوستانی اخبارات پر قلم اٹھایا جائے یہ نامناسب نہ ہوگا اگر مختصر آئیہ بھی بتا دیا جائے کہ دنیا میں اخبارات کس طرح وجود میں آئے۔

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اطلالیہ اخبارات کا مولد ہے ”ایکشا دای رینا“ (*Acta Diurna*) جس میں روزمرہ کے واقعات کا ذکر ہوتا تھا اور جس کا حوالہ سنیکا (*Seneca*) نے بھی اپنی تصانیف میں دیا ہے دنیا کا پہلا اخبار کہا جاسکتا ہے۔ یہ اطلاعات نہایت معتبر اور مستند ہوتی تھیں کیونکہ یہ حکومت روم کی طرف سے شائع کی جاتی تھیں لیکن جو لیس سیزر کی وفات کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا چارمس (*Chalmers*) کی تحقیق کے مطابق طرز جدید کا پہلا اخبار ۱۵۲۶ عیسوی میں نکلا۔ ایک قلمی اخبار تھا اس کا مقصد اہل و عیال کو وقت کے اہم سیاسی مسائل سے باخبر رکھنا تھا۔ اور ہر ماہ میں صرف ایک بار شائع ہوتا تھا سب سے پہلا انگریزی اخبار ”دی دیلی نیوز“ ۲۳ مئی ۱۷۲۲ء کو نکلا۔

ان ابتدائی اخبارات کے متعلق ایک مدبرانی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے ”یہ اخبارات مشترک اور بودے کا غذا کا ایک پلندا ہوتے تھے۔ جن میں کبھی منگھڑت واقعات اور مشکوک قصوں کا ذکر ہوتا تھا یا لوگوں کی بیجا مدح و ستائش کی جاتی تھی یا مخالفین پر فحش ور کیک حملے ہوتے تھے ان کی اشاعت پوشیدہ طریقہ سے ہوتی تھی ان کا مطالعہ زیر لب ہوتا تھا اور باتھوں یا تھ خفیہ طور پر ایک سے دوسرے تک پہنچتا تھا“

ہندوستان میں صورت حال بالکل مختلف تھی یہاں نہ ان کی صورت آغاز ہی اس درجہ شکستہ تھی اور نہ ان کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے کوئی خفیہ راہ عمل اختیار کرتی پڑی۔

یورپ میں اخبار کے اجرا کے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد ہندوستان میں اس کا وجود ہوا اور اس عرصہ میں لوگوں کے زاویہ نگاہ میں بین تبدیلی اور تغیر ہو چکا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے اواخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی ایک مستحکم سیاسی قوت بن چکی تھی انتظامی امور اور جدید تجارتی مہمات کے لئے انگریزوں کی ایک کثیر تعداد ہندوستان آنے لگی۔

تینوں احاطوں کے صدر مقام کلکتہ بمبئی اور مدراس میں انگریزوں کی آبادی روز بروز بڑھنے لگی یہ لازمی امر تھا کہ یہ نیا عنصر بہت دور رس نتائج اور اہم تبدیلیوں کا حامل ہوتا۔ سرزمین ہند میں نئے خیالات اور اداروں کی تخم ریزی ہونے لگی اخباری پریس انھیں اداروں میں ایک تھا اس کی ابتدا انفرادی مساعی اور ہمت کی رہنمائی ہے، کمپنی نے اس سلسلہ میں کوئی پیش قدمی نہیں کی۔

۱۸۶۸ء میں ایک شخص مسی مسٹر بولٹس (Messrs. Boulders) نے ایک اخباری مطبع قائم کر نیکی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ اس کے منصوبے عملی جامہ پہن سکیں فورٹ ولیم کی کونسل نے اس کو ہندوستان چھوڑنے کا حکم دیدیا کچھ عرصہ بعد ایک دوسرے شخص مسی جے۔ اے۔ کے (J. A. Keck) نے ایک پریس قائم کیا جس کو پرنٹنگ (چھپائی) پر ایک رسالہ کلکتہ کے جیل میں مل گیا تھا وہ قرضہ کے عدم ادائیگی کے جرم میں موقوف تھا اسے اس الزام کی تردید کی لیکن وہ اس قدر تند اور جھکی مزاج کا تھا کہ کوئی وکیل اس کے مقدمہ کی پیروی کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا، بالآخر اس کے ہمنام دوست نے جو ”ترک ولیم کے“ کا مصنف بھی تھا اس کے مقدمہ کی پیروی کا بیڑہ اٹھایا جس وقت وہ بحث کر رہا تھا، بکے مجنونانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا اور چلا چلا کر کہنے لگا کہ اس وکیل کو کچھ نہیں آتا اور میں اپنے مقدمہ کی بحث اور پیروی خود کروں گا، اس صرعی بیجان نے وکیل کو بہت صدمہ پہنچایا اور اس نے مزید بحث اور پیروی سے انکار کر دیا۔ دوبارہ استدعا پر اس نے مقدمہ پھر اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنے دوست کو بری کر دیا۔

اپنی رہائی کے بعد کے نے کلکتہ میں ایک پریس قائم کیا اور شائع میں سب سے پہلا ہندوستانی اخبار بنگال گزٹ کے نام سے نکالا اس اخبار کے اب صرف دو نسخے موجود ہیں ایک وکٹوریہ میموریل کلکتہ میں ہے اور دوسرا برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں۔ یہ اخبار ابتدا ہی سے بہت مقبول تھا اخبار ہندوستان میں بالکل ایک نئی چیز تھی اور اس لئے لوگ اس کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے، طنزیہ قصے اور کلکتہ کے مختلف اشخاص کو جو عرفیتیں دیکھتی تھیں پڑھنے والوں کی دلچسپی کو دوبالا کر دیتی تھیں۔

ایک شخص مسی مسٹر ٹریٹا (Treata) پرچہ کلکتہ ہی کے تھے ان کی خود نمائی اور بیجا طعناں کی وجہ سے سخت حملے ہوتے تھے اس زمانہ میں جب ہندوستان میں معدودے چند انگریز تھے گورنمنٹ ہاؤس کی

محل رقص و سرود میں ہر شخص شریک ہوتا تھا، مسٹر ٹی ریٹا ایسے مواقع پر کبھی نہ چوکتے اگرچہ جون کا مہینہ اور دم گھٹنے والی رات ہی کیوں نہ ہوتی۔ یہ شخص موزوں قد و قامت کا تھا لیکن بد قسمتی سے ناک بہت بڑی تھی اخبار نے لکھا ”نملکول“ (Nosey jargon) نے سُرخ محل کے سوٹ میں ایسا سالانہ رقص دکھلایا، اس روز سے مسٹر ٹی ریٹا نملکول (Nosey jargon) کے نام سے پکارے جانے لگے۔

اس اخبار میں محض محلے اور لوگوں کے متعلق بلا تفریق افترا پر دازیاں ہونے لگیں اس کے اڈیٹر نے دارن ہسٹنگز پر بھی جو اس وقت گورنر جنرل تھا حملہ کرنے کی جرأت کی حکومت نے محسوس کیا کہ اس بڑھتی ہوئی دبا کا تدارک کرنا چاہئے اور سرکاری ڈاکخانہ سے اس اخبار کی اشاعت بند کر دی پھر بھی اخبار کی اشاعت پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ حوالی کلکتہ میں بھی چیرا سیوں کے ذریعہ اخبار پہنچانے کا انتظام کر لیا گیا آخر کار بے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں گرفتار ہو گیا اور اُسے ہندوستان چھوڑنے کا حکم ہوا اس طرح دارن ہسٹنگز کے عہد حکومت میں اس اخبار کا گلا گھونٹ دیا گیا اور اس شرمناک طریقہ پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ گو اس جابرانہ طریقہ پر یہ اخبار بند کیا گیا تھا لیکن ابھی تک احتساب و نظارت نہیں قائم ہوئی تھی پریس کی کمزور ابتدا اور سُست نشوونما ابھی ان پابندیوں اور سختیوں کی متقاضی نہیں تھی۔

بنگال گزٹ کے امتناع نے مزید جرات آزمائیوں کا سلسلہ بند نہیں کیا، ۱۹۶۱ء سے ۱۹۵۷ء تک بہت سے انگریزی اخبار جاری ہوئے ان اخبارات میں جو احاطہ بنگال میں اس وقت جاری تھے کلکتہ جرنل۔ بنگال پرکار و جان بل کلکتہ کوریئر۔ انگلش مین۔ ریفارمر اور فرنڈ آف انڈیا جس کی ادارت سیرام پور کے عیسائی مبلغین کرتے تھے قابل ذکر ہیں۔ ان اخباروں کے مالک و مدیر غیر سرکاری اشخاص تھے، حکومت بنگال کا اپنا ترجمان گورنمنٹ گزٹ الگ تھا دوسرے احاطوں بمبئی و مدراس کے اخباروں میں بمبئی ٹائمز بمبئی کوریئر اور مدراس گزٹ قابل ذکر ہیں ان پرانے اخبارات کے نسخے امپیریل لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہیں اور مطالعہ کے لئے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں صرف تھوڑے سے اشخاص کسی انگریزی اخبار کا چندہ دے سکتے تھے۔ جان بل جیسے روزنامہ کا چندہ چونسٹھ روپیہ سالانہ اور آٹھ روپیہ ماہانہ ہوتا تھا۔ چار صفحات سے زیادہ پڑھنے کے قابل مواد نہ ہوتا تھا اور اس میں بھی زیادہ تر کلکتہ کے آس پاس کی خبریں درج ہوتی تھیں کبھی کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامی پالیسی پر بھی رائے زنی ہوتی تھی اور گاہے گاہے انگریزی رسالوں اور مجلوں کے اقتباسات بھی نکلتے رہتے تھے۔ یہ بیرونی انگریزی پرچے ان لوگوں کے پاس مستقل طور پر آتے رہتے تھے جو ان کے خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے۔

اٹیسویں صدی کے اوائل میں اخبارات ذاتیات اور گالی گارج میں بہت زیادہ حصہ لینے لگے ایک ڈیڑھ دوسرے اڈیٹر پر حملے کرتا تھا، اس وقت کے سب سے زیادہ مقبول اخبار کلکتہ جرنل نے معاصر اخبارات کے

محاسبین و معائب پر رائے زنی کر کے اپنے سر مصیبت مول لی اور اپنی بڑائی اور فوقیت کا سک جمانا چاہا معاصر اخبارات کے اڈیٹروں نے جے ایس بنگلہم اڈیٹر کلکتہ جرنل کے خلاف نہایت گندہ اور فحش پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا اس پر چار بیبیاں رکھنے کا الزام لگایا گیا اور مشہور تھا کہ اس کی ایک بیوی بیٹی پہونچ گئی ہے رپورٹ برائس نے جو ایشیاٹک مر کا اڈیٹر تھا بنگلہم پر نہایت ہیمانہ حملے کئے ۱۸۱۹ء میں کلکتہ جرنل نے انٹیلیجن چرچ کی ایک ٹنگ کی کاروائی شائع کی اور اس سلسلہ میں کپنی کے ایک کلرک مسمی ڈارول کا بھی حوالہ دیا اخبار کی اس معاندانہ نکتہ چینی نے ڈارول کو بہت صدمہ پہونچایا ایک روز شام کے وقت جب بنگلہم سیر و تفریح کے لئے جا رہا تھا اس سے ڈارول سے ملاقات ہوئی اس سے دریافت کیا گیا کہ کیا تم کلکتہ جرنل کے اڈیٹر ہو، اس سوال کے ساتھ اس پر چند کوڑے بھی لگائے گئے بنگلہم نے اس کا جواب اپنی چابک سے دیا۔ ایک دوسرے موقع پر بنگلہم نے ایک شخص مسمی ڈاکٹر جیمسن کے بیک وقت تین عہدوں کے قبول کرنے پر شدید نکتہ چینی کی جیمسن کو یہ نکتہ چینی بہت ناگوار گزری اور اس نے اڈیٹر کو دویل (کیکی) کی دعوت دی اس زمانہ میں (کیکی) ڈوئل کا عام رواج تھا۔ ڈوئل سے انکار بزدلی کے مراد خیال کیا جاتا تھا۔ درمیانی اشخاص نے معاملہ کو رفت و گزشت کر دیا۔

ان حملوں اور جوابی حملوں کے علاوہ اخبار اشتہارات سے پڑھتے تھے ان اشتہاروں کا نرخ چار آنے فی سطر ہوتا تھا زیادہ تر نیلاموں اور قہوہ خانوں کے اشتہار ہوتے تھے جہاں ہر قسم کے فواکھات مل سکتے تھے بیرونجات سے آئی ہوئی نئی کتابوں کے بھی اشتہار دئے جاتے تھے کلیات باؤرن گیمسٹر کے اعترافات اور ایک مجروح شخص کے اعترافات کے قسم کی کتابیں انگلش سوسائٹی میں بہت مقبول تھیں تھیٹر کی خبریں اور گھوڑ دوڑ کے اشتہار بہت نمایاں طور پر شائع کئے جاتے تھے۔ سال بھر لائبریریوں کا سلسلہ جاری رہتا اور لوگوں کے جوش و خروش کا باعث ہوتا تھا۔ اس کے اعلانات اخبارات کی خصوصیت تھے ان کے علاوہ زیادہ تر اشتہارات نقالی رقص اور ازدواجی رشتوں کے متعلق ہوتے تھے یہ نقالی رقص نوجوانوں میں بہت عام تھا اور اکثر اس کا نتیجہ شادی کی صورت میں برآمد ہوتا تھا۔ ازدواجی رشتوں کے اشتہارات میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا جاتا تھا کہ لڑکی کو کسی قسم کی جگر کی بیماری نہ ہو۔

اخباری پریس کی تاریخ میں ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے ہندوستان کے انگریزی صحافت نگار اپنے انگلستانی معاصرین کے نقش قدم پر چل رہے تھے انگلستان کا پریس جماعتی حملوں کا شکار ہو چکا تھا انیسویں صدی کے اوایل کے اخباروں کے افتتاحیہ مقالے دہگ اور ٹوری جھگڑوں سے پر نظر آتے ہیں۔ اڈیٹروں کی باہمی جنگ اکثر اخباروں کے افتتاحیوں سے آگے بڑھ کر عدالت کے اکھاڑوں تک پہونچ جاتی تھی بیشتر اوقات ”ڈوال“ سے کام لیا جاتا ۱۸۳۱ء میں ”لندن میگزین“ اور ”بلیک وڈ میگزین“ کے اڈیٹروں کے درمیان ایک

یادگار "ڈول" لڑا گیا اخبار نویس خواہ وہ کسی جماعت کے حامی ہوتے کسی حالت میں بھی محفوظ و مامون نہ تھے۔
 یقیناً انگلستان میں بمقابلہ ہندوستان کے بہت زیادہ اخبار نکل رہے تھے اُنیسویں صدی کے ابتدائی
 تیس سال میں ہندوستان میں تیس اخبار سے زیادہ کا وجود نہ تھا برخلاف اس کے برطانیہ میں دو سو چوٹن اخبار جاری
 تھے اور ان میں سے بعض کی صبح و شام دونوں وقت اشاعت ہوتی تھی، ہندوستان میں چندے اور ڈاک کے محصولات
 کی زیادتی کی بنا پر بہت کم لوگ مستقل طور پر اخبار خریدتے تھے اس کے برخلاف انگلستان میں ایک ایک اخبار کی
 اشاعت ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔

اس طرح انگریزی سوسائٹی سے ہندوستان اور اس کے باشندوں نے ایک نیا ادارہ حاصل کیا،
 ہندوستانیوں نے بھی ایسے آلہ سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہیں کی جو ان کے خیالات اور شکایات کی ترجمانی کرے
 اس وقت کلکتہ میں ہندوستانیوں کا ایک بڑھتا ہوا گروہ تھا جس کو مغربی تعلیم سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔
 صدی کے ابتدائی بیس سال کے اندر بعض سربراہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کوششوں سے
 ودالیا ایگلو انڈین کالج قائم ہو چکا تھا (David Hain) مسٹر ڈیوڈ میمر اور راجہ رام موہن رائے دونوں
 جماعتوں کے سرگروہ تھے ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہندوستانیوں کی تعلیم میں دلچسپی لینے لگی تھی اٹھارہ سو تیرہ عیسوی کے
 چارٹر ایکٹ کی اُس دفعہ کو جس میں ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی منظوری تھی عرصہ سے معرض
 التوا میں ڈال رکھا گیا تھا، اس حقیقت کے پیش نظر کہ مشنریوں نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے اسکول اور
 درسگاہیں قائم کرنا شروع کر دی تھیں اور خود کمپنی اپنے بڑھتے ہوئے حدود اختیار کی بنا پر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی
 خدمات حاصل کرنے کی خواہشمند تھی، حکومت کی جانب سے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق کوئی مستقل طرز عمل اختیار
 کرنے میں کسی قسم کی تعویق برداشت نہ کی جاسکتی تھی، انگریز افسروں کی اکثریت اور ترقی پسند ہندوستانیوں کا گروہ
 انگریزی کو عدالتی زبان بنانے کے لئے بہت زور دیر ہا تھا جیسا کہ بالآخر ۱۸۳۳ء میں ہوا۔ یہ ایک بالکل فطری اور
 قدرتی امر تھا کہ جس وقت ایسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور تعلیم کے لئے اس قدر آسانیاں ہم پہنچانی جا رہی تھیں
 اہل ہند صحافت کی طرف مایل ہو جاتے سب سے پہلا ہندوستانی اخبار "درپن" تھا۔ لیکن اس کی ادارت سیرام پور
 کے عیسائی مبلغین کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس لئے اس کو خالص ہندوستانی پرچہ نہیں کہہ سکتے۔ ۲۲ مئی ۱۸۱۸ء کو اسکا
 آغاز ہوا اور لارڈ ہسٹنگز نے جو اس وقت گورنر جنرل تھا اس کی نشوونما اور ترقی میں بڑی مدد دی اس نے ہندوستانی
 پریس کی نشوونما میں بڑی دلچسپی لی اور ان لوگوں کے خیالی خطرات سے متاثر نہ ہوا جو ایک آزاد ہندوستانی پریس کی
 موجودگی کو بہت مخدوش سمجھتے تھے، لیکن ہندوستانی صحافت کے پہلے رہنما راجہ رام موہن رائے تھے وہ اپنے

وقت کے سب سے بڑے ہندوستانی تھے اور ان کو بجا طور پر ہندوستانی قومیت کا بانی کہہ سکتے ہیں، ۱۸۲۱ء میں کلکتہ جرنل کی ایک اشاعت میں ہفتہ وار بنگالی پرچہ "سمبد کو مودی" (সম্বদ কৌমুদী) کا کیفیت نامکلا جس اس ڈی کاٹ (J. D. Collett) نے راجہ رام موہن رائے کی سوانحی میں اس اخبار کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ ایک خالص ہندوستانی پرچہ تھا جس کو مقامی باشندے مقامی زبان میں نکالتے تھے" اس اخبار کو ہندوستانی (ورناکیولر) اخباروں کا پیشرو اور راجہ موصوف کو ان کا بانی کہنا چاہئے۔ اس اخبار کے دوش بدوش اور بھی کئی بنگالی اخبار نکلنا شروع ہوئے ان اخباروں میں اقتصادی ادبی اور سیاسی مضامین کی بھرمار ہوتی تھی۔ سمبد کو مودی کی ایک اشاعت میں کلکتہ کے مجسٹریٹوں کے نام ایک اپیل بھی شائع کی گئی تھی جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کلکتہ کے ہندو باشندگان کی جان کی حفاظت کے لئے عیسائی عمال کی بے لاگ گناہیابی کے انسداد کے لئے سخت ترین قوانین مرتب کریں جو نہایت لاپرواہی سے اپنی گاڑیاں بھگاتے ہیں اور بلا امتیاز عمر و جنس راگھیروں پر ہنٹر چلاتے ہیں۔

راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۲ء میں ایک فارسی ہفتہ وار نکالا اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک برہمنی میگزین جاری کیا۔ راجہ موصوف غیر متعصب "وسیع النظر" جماعت کے سرگروہ تھے اور ان ترجمانوں (آرگن) کے ذریعہ ہندو سماج کی خرابیوں پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اس وقت بنگال میں سستی کا عام رواج تھا راجہ ممدوح اور ان کے ہمسر اس کے نہایت پرچوش مخالف تھے لیکن متعصب اور تنگ نظر گروہ اکثریت میں تھا اور ترقی پسندوں کی مخالفت میں انھوں نے اپنا ترجمان "چندریکا" نکالا جو اس وقت کے تمام ہندو مذہبی اداروں کا علمبردار تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اور بھی بہت سے اخبار وجود میں آئے ۱۸۲۳ء میں صرف کلکتہ سے سولہ اخبار نکل رہے تھے دوسرے احاطوں اور کے صوبہ متحدہ میں جو اس وقت نشیبی صوبہ کہلاتا تھا (لوہر پراونس) بھی صحافتی جرات آزمائیاں شروع ہو گئی تھیں۔

ہندوستانی (ورناکیولر) اخبارات نہایت آزادی کے ساتھ ہر مسئلہ پر اظہار رائے کرتے تھے یہاں تک کہ برطانیہ کی یورپی پالیسی پر بھی نکتہ چینی کرنے سے باز نہ آتے تھے اور کمپنی کی ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کا نہایت طنز یہ طریقہ پر اعادہ کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے مقالات سے انگریزوں کے احساسات کو چوٹ لگتی تھی اس لئے انکی یہ بے لگامی عرصہ تک جاری نہ رہ سکتی تھی انگلستان کا ٹوری پریس ہندوستانی پریس کی آزادی سلب کرنے کے لئے سب سے زیادہ ہنگامہ برپا کئے ہوئے تھا۔ اب ہم تاریخ صحافت و اخبار نویسی کے سب سے زیادہ اہم دور کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنی احتساب و نظارت کا قیام۔

۱۸۹۱ء کے قبل ہندوستانی پریس انگلستان کے قانون اہانت کے علاوہ کسی اور قانون کے ماتحت نہ تھا اس طرح ہندوستانی پریس انگریزی پریس کے ہمسطح تھا۔

گورنر جنرل "اجازت نامہ" ضبط کر سکتا تھا اس لئے نہیں کہ کمپنی کے حدود اقتدار میں پریس نہ چلایا جاسکے بلکہ اس لئے کہ کون انگریز ہندوستان میں سکونت پذیر ہے۔ انگریزوں کو ہندوستان میں سکونت کے لئے "اجازت نامہ" کی ضرورت ہوتی تھی اور کسی قابل اعتراض حرکت کی پاداش میں ہندوستان بدر کئے جاسکتے تھے۔ بکے کے گزٹ کے امتناع و ضبطی میں اسی حربہ سے کام لیا گیا تھا اور اس کے اڈیٹر کو مجبوراً ہندوستان چھوڑنا پڑا ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۸ء کے درمیانی وقفہ میں عسکری واقعات پر نکتہ چینی کرنے کے جرم میں دو اڈیٹروں کی شدید گونہائی ہوئی اور ایک فوجی افسر جو کستانی کے عہدہ پر فائز تھا انگلستان واپس کر دیا گیا اس کا جرم یہ تھا کہ اُس نے فوجی ملازمین کے نام ایک نہایت اشتعال انگیز پیغام شایع کیا تھا ۱۹۷۸ء میں ایک شخص مسٹر میکین صرف اس جرم میں ہندوستان سے نکالا گیا کہ اس نے ایکسچج پر شدید نکتہ چینی کی تھی۔ کمپنی کے بعض برہمن ملازمین نے ان ہی اخبارات میں اپنے غم و غصہ کا اظہار شروع کر دیا تھا یہ "اقتدار اعلیٰ" کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اب کمپنی کا سیادتی اقتدار بڑھتا جا رہا تھا اور اس کے انتظامی شعبہ کے متعلق بے لگام نکتہ چینی کسی طرح برداشت نہ کی جاسکتی تھی کمپنی کو خوف تھا کہ ان حملوں سے پہلے کی نگاہوں میں اس کی وقعت کم ہو جائے گی۔

لارڈ ویلزلے نے اخبارات کے لئے نہایت سخت قوانین مرتب کئے اور ان کی نگرانی کے لئے احتساب و نظارت قائم کیا ان قاعدوں کی رو سے ہر اڈیٹر اخبار کے نیچے اپنا نام لکھنے پر مجبور تھا اسکے لئے ضروری تھا اپنے نام و پتہ سے گورنمنٹ کو باخبر رکھے، اتوار کے دن کوئی اخبار نہ نکلتا تھا، ان قواعد کی خلاف ورزی اور نظارت کے احکام کی عدم پابندی کی پاداش میں اجازت نامہ ضبط کر لیا جاتا تھا، ان پابندیوں سے انگلستان کی برسر اقتدار جماعت کے رویہ کا اندازہ ہوتا ہے اس وقت وہاں ٹوری جماعت برسر اقتدار تھی۔ اور اس کو ہندوستان میں ایک آزاد پریس کی ترقی سخت ناپسند تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا قیام ہندوستانی عوام کی جہالت اور حکام کے اعمال کی علانیہ نکتہ چینی کی بندش ان دو ستونوں پر قائم ہے۔ ۱۸۷۱ء میں حکومت بنگال کے حکم سے ایک سرکاری پریس قائم کرنے اور ایک سرکاری اخبار کا خاکہ (پلان) طیار کیا گیا آخر الامر پریس قائم ہوا اور اخبار کا نام گورنمنٹ گزٹ رکھا گیا یہ کارردائی اسوقت کے اخبارات کی مخالفت نکتہ چینی کے رد کرنے کے لئے کی گئی تھی۔

۱۸۷۱ء اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً پریس کی آزادی سبب کرنے کے لئے مختلف ضابطے اور قاعدے بنتے رہے، عسکری احکامات اور جنگ کی خبریں اسوقت سے شایع ہونا بند ہو گئیں ۱۸۷۱ء میں پریسوں کے مالکوں کو اخبارات میں اپنا نام لکھنے کا حکم ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں مزید قیود اور پابندیاں بڑھادی گئیں اخبارات اور ان کے ضمیموں کے تمام مسودوں کا چیف سکریٹری (مستند خصوصی) کی نظر ثانی کے لئے پیش ہونا لازمی قرار دیا گیا

دستی اشتہارات و نوٹوں کے مسودے بھی نظر ثانی کے بغیر شایع نہ ہو سکتے تھے۔ سابق قاعدے اور قانون بدستور اپنی جگہ پر تھے بلکہ اب ان پر پہلے سے زیادہ عملدرآمد ہونے لگا تھا مسمی مسٹر ایڈمس (Adams) جو اس وقت احتساب و نظارت کے عہد پر فائز تھا، ٹوری رائے کا نہایت بیباک حامی تھا اس کی سختی کے ساتھ یہ رائے تھی کہ پریس کو پوری قوت کے ساتھ قابو میں رکھنا چاہئے پریس کے احتساب و نظارت کی تاریخ میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

بھٹی اور مدراس کے احاطوں نے پریس کے قوانین کے لئے بھی بنگال کی خوشہ چینی کی جیسا کہ اس سے قبل وہ اور امور میں کیا کرتے تھے۔ مذکورہ بالا احاطوں میں پریس سے متعلق بنگال ہی کے ایسی پابندیاں رائج تھیں۔ اڈیٹر کو اکثر جبریہ کی جاتی تھی اور بعضوں کو ہندوستان سے نکال بھی دیا جاتا تھا۔

مارکولس آف ہسٹنگز نے جو ۱۸۱۳ء سے ۱۸۲۳ء تک کمپنی کے سیاہ و سپید کا مالک تھا نظارت و احتساب کو ۱۸۱۸ء ہی میں منسوخ کر دیا اس کا خیال تھا کہ ایک آزاد پریس اچھی حکومت کے حق میں بہت حد تک مدد و معاون ثابت ہوگا کمپنی کی حکومت کا سب سے بڑا عیب اس کے عمال کی سستی و کاہلی تھی ایک شخص مسمی اسٹین ہوپ نے اپنے رسالہ ہندوستان میں ”برطانوی پریس کے اثرات“ میں لکھا ہے ”حکومت مدراس کو معتد عسکری سے کسی معمولی مراسلہ کا جواب حاصل کرنے میں اسی قدر کاغذ و شنائی اور وقت صرف کرنا پڑتا تھا جتنا کہ لارڈ جینسلر کی عدالت کے کسی بہت بڑے مقدمہ کے تصفیہ میں ہوتا ہے“ پریس کی نکتہ چینی اور اعتراض سے معاملہ میں عجلت ہو سکتی تھی اس کے علاوہ ہسٹنگز کا ایک خیال اور بھی تھا۔ اس وقت تک یہ بے قاعدگی تھی کہ ہندوستانی اپنے قلم کو آزادی کے ساتھ استعمال کر سکتے تھے کیونکہ ان کو ملک بدر کئے جانے کا کوئی خوف نہ تھا اور ان کو ہندوستان میں رہنے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ پریس کو آزادی حاصل ہو گئی تھی تاہم اس کے معنی یہ ہرگز نہ تھے کہ جملہ قیود و پابندیاں ہٹا دی گئی تھیں چند قاعدے ایسے بنائے گئے تھے جن کی پابندی ہر اڈیٹر کے لئے لازمی تھی۔

نمبر ۱۔ نوٹ آف ڈائریکٹرس کی کارروائی گورنر جنرل کے احکام کونسل کے ممبر اور جج گستاخانہ و بے باکانہ نکتہ چینی سے بالاتر تھے۔ نمبر ۲۔ فیضیت آمیز واقعات اور ذاتیات بالکل ممنوع تھی نمبر ۳۔ ہندوستانیوں کے احساسات کا پاس و لحاظ لازمی تھا نمبر ۴۔ بیرونی رسالوں کے ایسے اقتباسات کا شیوع ممنوع قرار دیا گیا جن سے تنفر اور خوف و ہراس پیدا ہو۔ ان قوانین کے نفاذ سے پہلے عدالت عالیہ (سپریم کورٹ میں انکی رجسٹری لازمی تھی۔

کورٹ آف ڈائریکٹرس کو لارڈ ہسٹنگز کا یہ اقدام پسند نہ آیا اور وہ لارڈ موصوف کے احکامات کو منسوخ کر کے از سر نو نظارت و احتساب قائم کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک سرکاری مراسلہ کا مسودہ بھی طیار کیا گیا اور ۱۸۲۲ء کو وہ مراسلہ بورڈ آف کنٹرول کو اس واسطے ارسال کیا گیا کہ وہ اس میں تحریر کردہ معروضات کے مطابق گورنر جنرل کے نام احکامات صادر کر دے لیکن بورڈ مذکور نے اس کی تعمیل نہیں کی۔ جس سال نظارت و احتساب منسوخ کیا گیا کلکتہ

سے ایک اخبار کلکتہ جرنل نامی نکالا گیا اس کا مدیر ایک شخص سہمی مسٹر جے اس بکنگھم تھا۔ جس کا اوپر ذکر آچکا ہے احتساب و نظارت کی تاریخ میں جو عہد اخبار مذکور اور اس کے مدیر نے لیا قابل یا دگار ہے احتساب و نظارت کی منسوخی پر تمام احاطوں میں اظہار مسرت کیا گیا اگرچہ مدراس میں اس وقت بھی اس کا نفاذ تھا کلکتہ جرنل کے افتتاحی مقالوں میں گورنر جنرل کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کیا گیا اور حکومت مدراس کے رویہ کی سخت مذمت کی گئی یہ اخبار ابتدا ہی سے بہت مقبول ہو گیا اور اس نے نہایت جرأت آموز رویہ اختیار کیا۔ اخبار کا کافی حصہ انفرادی، شکایات کے رفع کرنے کے لئے وقت تھا حکومت کے مختلف احکامات پر نکتہ چینی کرنے کے لئے تعداد میں مراسلے نکلنے لگے۔ ایک شخص سہمی کرنل رابنسن (Col. Robinson) نے جس نے اپنا اخباری نام "سیمونل سوبر سائیس" (Simons) رکھ لیا تھا اشتعال انگیز مراسلات کا ایک سلسلہ شایع کیا جس کی پاداش میں اس کو اپنی فوجی ملازمت سے استعفا دیکر انگلستان واپس جانا پڑا اخبار کے اڈیٹر کو اس قسم کے مراسلات چھاپنے کی معذرت کرنی پڑی۔

مسٹر جے اس بکنگھم نے اپنے سر دوسری مصیبت یہی کہ مسٹر ایلیٹ کی مدراس کی گورنری کی خبر کو چوڑے سیاہ حاشیہ کے ساتھ شایع کیا گویا یہ امر عمومی ماتم کا باعث تھا مدراس گورنمنٹ نے اس پر شدید نکتہ چینی کی اور حکومت بنگال نے بکنگھم کو معافی مانگنے پر مجبور کیا کلکتہ جرنل حکومت کی ہمدردی سے محروم ہو گیا مسٹر ایڈمس جو چیف سکریٹری کی حیثیت سے نظارت اور احتساب کے فرائض بھی انجام دیتے تھے جواب سنیر ممبر کے مرتبہ پر پہنچ گئے تھے اس اخبار کے جانی دشمن تھے۔ ۱۸۲۳ء میں لارڈ ہسٹنگز اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے اور ان کے منتخب جانشین لارڈ ڈام پرسٹ کے پہنچنے تک گورنر جنرل کے تمام فرائض بوجہ کونسل کے سنیر ممبر ہونے کے مسٹر ایڈمس کے سپرد ہوئے مسٹر ایڈمس نے اپنے عہدہ کی باگ ہاتھ میں لیتے ہی ایک شخص سہمی ریورنٹ ڈاکٹر برائٹس کا جس کا ذکر ایشیاٹک مرر کی ادارت اور بکنگھم کے سلسلہ میں آچکا ہے بحیثیت اسٹیشنری فرائض کرنے والی کمیٹی کے کلرک کا انتخاب کیا اس تقرر کا اعلان گورنمنٹ گزٹ کی ایک غیر معمولی اشاعت میں ہوا۔ یہ غیر معمولی اقدام تھا اور کلکتہ جرنل کے اڈیٹر نے اپنی اشاعت مورخہ ۸ فروری ۱۸۲۳ء میں اس پر نہایت طنزیہ رائے زنی کی اس مقالہ نے قلام مقام گورنر جنرل کو بہت مشتعل کر دیا اور ۱۲ فروری ۱۸۲۳ء کو مسٹر بکنگھم کا اجازت ضبط کر لیا گیا اور ان کو انگلستان واپس کر دیا گیا۔ یہ غیر متوقع مصیبت تھی اخبار مذکور کے کافی خریدار تھے اور مسٹر بکنگھم کا کام بھی بہت فروغ پر تھا اس کو اپنا کاروبار اپنے ایک ماتحت کے سپرد کر کے ہمیشہ کے لئے ہندوستان کو خیر باد کہنا پڑا کچھ عرصہ تک اخبار جاری رہا لیکن دوسرے اڈیٹر پر بھی عرصہ حیات تنگ ہو گیا اور اس کے چلے جانے کے بعد پرچہ بند ہو گیا مسٹر بکنگھم کی مالی حالت بالکل خراب ہو گئی اس نے پریوی کونسل میں اپنے معاملہ کے متعلق ایک غیر جانبدارانہ تحقیقات کی درخواست دی کمیٹی مقرر ہوئی اور اس کی سفارشوں کی بموجب مسٹر بکنگھم کے نقصان کی تلافی بھی کر دی گئی، لیکن ہندوستان کی واپسی کی درخواست منظور نہ ہوئی۔

ایڈمس کی گورنمنٹ نے پریس کی آزادی کو محدود کرنے کے لئے مزید قاعدے بنائے لیکن نفاذ سے قبل انکی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں رجسٹری ہونا لازمی تھی سرفرائس میکناٹن نے جو اس وقت تنہا قائم مقام جج تھے شاکی جماعت کو اپنا محضر نامہ (میموریل) پیش کر کے اجازت دی معترضین میں پیش پیش راجہ رام موہن رائے تھے، دو عرضداشتیں پیش کی گئیں، دوسری عرضداشت کو جو بالعموم راجہ موصوف کے زور قلم کا نتیجہ سمجھی جاتی تھی مس کالیٹ نے ہندوستانی تاریخ کے "ایریوٹیک ٹیکا" کے نام سے موسوم کیا ہے سرفرائس نے جدید قواعد کی تائید کی اور معترضین کے خلاف فیصلہ دیا۔ راجہ مدوح اور ان کے حلیفوں نے شاہی دربار میں اپیل کی ان کا اپیل انگریزی مضمون نویسی کا ایک نادر نمونہ تھا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، راجہ رام موہن رائے نے احتجاجی طور پر "مراۃ الاخبار" کی ادارت بند کر دی ان کا یہ اقدام کلکتہ کے انگریزوں کو بہت ناگوار معلوم ہوا۔

لارڈ ام ہرسٹ نے حکومت کی باگڈور ہاتھ میں لیتے ہی کمپنی کے ملازمین کو پبلک پریس سے کسی قسم کا تعلق رکھنے کی ممانعت کر دی لارڈ موصوف کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد ان کے جانشین لارڈ ولیم ہٹنگ نے بھی وہی مروجہ طرز عمل اختیار کیا پریس کی آزادی اس سے زیادہ کبھی سلب نہیں ہوئی ہٹنگ کے مالی ضابطوں اور بالخصوص "نصف بھتے" کی منسوخی نے فوجیوں میں سخت غم و غصہ اور اشتعال پیدا کر دیا۔ مقالات کی بھرمار شروع ہو گئی اور بالآخر حکومت کو اسے زبردستی بند کرنا پڑا گورنر جنرل نے تمام اخبارات کے نام احکامات صادر کر دیے کہ "بھتے" کے مسئلہ پر مزید مضامین نہ قبول کئے جائیں کلکتہ جرنل کی ضبطی سے اڈیٹروں کی آنکھیں کھل چکی تھیں اور اس موضوع پر مزید مضامین نہیں نکلے۔

۱۸۳۵ء میں ہٹنگ کی جگہ سر چارلس ڈکاک گورنر جنرل ہوا، پریس کی آزادی کی تاریخ میں اس کا نام خاص طور پر قابل یادگار ہے اس نے احتساب و نظارت کو یک قلم منسوخ کر دیا اس خیال کا موجد لارڈ میکالے تھا جو ہندوستان میں گورنر جنرل کی کونسل کا سب سے پہلا مشیر قانونی (لامبر) ہو کر آیا اور سر چارلس ڈکاک نے اس کو عملی جامہ پہنایا اس واقعہ کی یادگار منانے کے لئے کلکتہ میں ایک عظیم الشان ہال طیار کرایا گیا اور اس کا نام "ڈکاک ہال" رکھا گیا۔ کورٹ آف ڈائریکٹرس نے اس اقدام کو بہت ناپسند کیا گورنر جنرل کی کونسل کے بعض ممبروں کو شدید بدگمانیاں تھیں، انگلستان میں دارالعوام کی رائے بھی ایسے اقدام کے قطعاً مخالف تھی۔ ۱۸۱۱ء میں ایوان مذکور میں ہندوستانی پریس کی آزادی کے لئے بہت پر زور تقریریں ہوئی تھیں لیکن اب حالات بالکل بدل چکے تھے انگریزوں کو اپنے سامراجی مفاد ایک محکوم ملک میں آزاد پریس کے قیام کی بے آہنگی کا شعور بڑھتا جا رہا تھا آزاد پریس اور آزاد ادراہ لازم و ملزوم چیزیں خیال کی جاتی تھیں۔

۱۸۵۷ء تک پریس آزاد رہے اس تاریخی سال میں ہندوستان کے افق پر بد امنی اور خوف و ہراس کے

بادل چھانے لگے فوجوں میں بغاوت شروع ہو گئی اور حکومت نے خطرات کی بوباس پاتے ہی پریس کو قابو میں لانے کے لئے فوری اقدامات شروع کر دئے۔

۱۸۵۷ء کے ایکٹ ۵۱ نے بغیر لائسنس حاصل کئے ہوئے پریس کے قیام و استعمال کو ممنوع قرار دیدیا حکومت اجازت نامہ دینے میں اختیارات تمیزی سے کام لیتی تھی حکومت کو حق تھا کہ جسوقت بھی وہ چاہے اجازت نامہ منسوخ کر دے اخباروں کی اشاعت کتابیں یا کسی قسم کی اشتعال انگیز تحریر ممنوع قرار دی جا سکتی تھی۔ یہ ایکٹ ہندوستانی (ورناکیولر) اور انگریزی دونوں پریسوں کے لئے تھا یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اب تک ہندوستانی (ورناکیولر) اور انگریزی پریس میں کوئی امتیاز نہیں تھا ۱۸۳۵ء کے ایکٹ سے پریسوں کو جو آزادی ملی تھی وہ دونوں کے لئے یکساں تھی اسی طرح جب آزادی چھین لی گئی تب بھی دونوں یکساں طور پر متاثر ہوئے۔

پریس کی تاریخ اپنی اوایل عمر میں واقعات اور حادثات سے خالی تھی اسکے سن شعور کے پہونچنے تک اسمیں گونا گونیت اور مدوجز پیدا ہونے لگا۔ لیکن اسوقت یہ دور ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ذیل میں غیر آئینی دور کے ان احکام و قوام کا ضمیمہ درج ہے جو اخبارات کے متعلق وقتاً فوقتاً وضع ہوتے رہے۔

نمبر شمار	سال عیسوی نام گورنر جنرل	قانون یا حکم	مقصد	اسباب جن میں حکم صادر ہوا یا قانون وضع کیا گیا	کیفیت
(۱)	۱۷۷۲-۸۶ لارڈ ہیڈنگ	اجازت نامہ	اجرا اخبار	۱۷۷۳ء میں بروئے ریگولیشن ایکٹ گورنر جنرل عدالت عالیہ کا تقرر ہوا اس کے سات برس کے بعد حکومت نے اپنا گزٹ شائع کیا و نیز دواوردو اخبارات انگریزوں نے جاری کئے۔ کوئی خاص حکم یا قانون نہ تھا۔	(۱) گورنمنٹ بنگال گزٹ ۱۷۸۰ (۲) کلکتہ گزٹ ۱۷۲۲ (۳) ہیکلی گزٹ ۱۷۸۰ (۴) دی ٹائمز ۱۷۸۵
(۲)	۱۷۸۶-۹۳ کارنوالس	"	"	"	۱۷۸۹ء میں ہیکلی گزٹ ۱۷۹۰ء میں ہیکلی گزٹ

نمبر شمار	سال عیسوی و نام گورنر جنرل	قانون یا حکم	مقصد	اسباب جن میں حکم صادر ہوا یا قانون وضع کیا گیا	کیفیت
(۳)	۱۷۹۳-۹۸ سرجان شور	احکام	ہر اخبار سرکاری طور پر پہلے معائنہ ہولیتا تھا تب شایع کیا جاسکتا تھا بصورت خلاف ورزی سزا جلا وطنی تھی۔۔	اس وقت تک کوئی اخبار ملکی زبان میں جاری نہ تھا اور نہ کسی ہندوستانی نے کوئی اخبار جاری کیا تھا مگر متعدد اہالیان مغرب اخبارات جاری کر رہے تھے۔ انگریزوں کے سامنے اس زمانہ میں دو بہت بڑی مہمیں تھیں (۱) نیپولین ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا نیپولین کی امانت افغانستان سے نیپولین کی امانت کے خطرات تھے جو ۱۷۹۹ء میں کم ہوئے۔ (۲) تیسری مرتبہ جنگ بھی چھڑ گئی تھی جو ۱۸۰۲ء میں ختم ہوئی۔	۹۹-۹۱ تک متعدد انگریزوں اہل یورپ ہندوستان سے بدر کر دیئے گئے کسی سرکاری عملہ یا ملازم کے متعلق کوئی تنقید یا اعتراض جبرم سمجھا جاتا تھا۔ بغیر کسی باضابطہ مقدمہ کے سرائیں دیجاتی تھیں۔
(۴)	۱۷۹۹-۱۸۰۴ ولزلی	"	"	نیپولین کی شکست وائٹلو ۱۸۱۵ء کے بعد کوئی بیرونی حملہ کا خدشہ باقی نہیں رہ گیا تھا اور ہندوستانیوں سے کسی قسم کا خطرہ اس وقت تک نہیں تھا اس لئے اب ولزلی کے وضع کردہ قوانین کی ضرورت نہ تھی۔	(۱) ۱۸۱۸ء بنگالی زبان میں سب سے پہلا اخبار سماچار درپن جاری ہوا جسکی ادارت ایک مسیحی مشنری کے ہاتھوں میں تھی مقام اشاعت سیرام پور۔ (۲) ۱۸۲۲ء میں سب سے پہلا ہندوستانی اخبار ایک ہندوستانی کی زیر ادارت بھی سماچار عامی ممبئی سے جاری ہوا۔ متعدد دیگر انگریزوں نے بھی اخبارات جاری کئے۔
(۵)	۱۸۱۸-۱۸۲۳ مارکوئس ہڈنگ	"	سرجان شور و ولزلی کے زمانہ میں جو سخت قوانین تھے وہ منسوخ کر دیئے گئے۔	۱۸۱۸ء بنگالی زبان میں سب سے پہلا اخبار سماچار درپن جاری ہوا جسکی ادارت ایک مسیحی مشنری کے ہاتھوں میں تھی مقام اشاعت سیرام پور۔ (۲) ۱۸۲۲ء میں سب سے پہلا ہندوستانی اخبار ایک ہندوستانی کی زیر ادارت بھی سماچار عامی ممبئی سے جاری ہوا۔ متعدد دیگر انگریزوں نے بھی اخبارات جاری کئے۔	

نمبر شمار	سال عیسوی و نام گورنر جنرل	قانون یا حکم	مقصد	اسباب جنہیں حکم صادر ہوا یا قانون وضع کیا گیا	کیفیت
(۶)	۱۸۲۰ء ایڈم	خاص حکم	سلکٹنگ کم نامی ایک سولینٹ اپنے مضامین میں حکومت پر اعتراض کے	ایڈم نے چند مہینوں تک بحالت غیر موجودگی لارڈ ہسٹنگس کی قائم مقامی کی تھی۔	
(۷)	۱۸۲۳-۲۸ لارڈ ایمرسٹ	احکام	ہسٹنگس کے قوانین احکام کی تقلید	چونکہ اس وقت میں کوئی لارڈ نہیں تھا لہذا اس کے لئے ایک ایجنسی مقرر کی گئی۔	
(۸)	۱۸۲۸-۳۳ ولیم بینٹ	"	"	۱۸۳۴ء میں لارڈ بینٹ پہلے گورنر جنرل ہندوستان کے تسلیم کئے گئے اور بغرض مشورہ ایک کونسل قائم کی گئی۔	
(۹)	۱۸۳۵ لارڈ میکناٹ	"	اخبارات مطابحہ کیلئے یہ دو مطابحہ کیلئے دو آدھادی کہا جاتا ہے ایک سال کو دو حکومت میں میکناٹ نے اکثر اصلاحات کی کوششیں کیں	۱۸۳۵ء میں بمبئی ٹائمس جاری ہوا	
(۱۰)					
(۱۱)	۱۸۵۸ لارڈ کینیٹ	گیسٹنگ ایکٹ	زبان بندی	۱۸۵۸ء میں اس کے تحت محسوس ہوئی کہ عوام میں زبانوں کے درمیان باغیانہ مضامین شاعت کریں اس لئے یہ قانون جاری کیا گیا۔	۱۸۵۸-۵۹ تک کوئی خاص حکم یا قانون مطابحہ یا اخبار کے متعلق جاری نہیں ہوئے لارڈ میکناٹ کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہوا کہ تقریباً تمام بڑے شہروں میں مثلاً دہلی، آگرہ، دکن، لاہور میں اخبارات جاری ہو گئے۔ پریس کے متعلق یہ قانون تھا جو حکومت نے جاری کیا۔ اس کے پہلے محض احکام و ریگولیشن سے کام لیا گیا۔ گیسٹنگ ایکٹ صرف ایک سال تک جاری رہا پھر منسوخ کر دیا گیا۔ اندر کے بعد انگریزوں نے جو سزا دی تھی اس کی صورتیں اختیار کیں وہ اس قدر عبرت انگیز تھیں کہ دہلی، لاہور، کراچی کے دلوں پر ان کا رعب و خوف قائم رہا۔ بعد اقسام اندر ہندو اور مسلمان اخبارات میں اس امر کا متنازعہ رہا کہ کون حکومت کا زیادہ وفادار اور کامیاب ہو اس لئے کسی خاص قانون کی مدد سے ضرورت محسوس نہیں ہوئی

(نوٹ) غیر اضمیمہ اصل مضمون میں نہیں تھا۔ میں نے اس کو ذاتی محنت و تلاش سے فراہم کیا ہے۔ - نمبر ۱ - ترجمہ زیادہ تر آزاد ہے۔

مترجمہ: سید محمد عبدالعلیم ہاشمی - غازی پور

مسٹر او۔ پی۔ بھٹناگر - پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی -

مکتوبات نیاز

بندہ نواز ، آپ کی مہربانیوں کا شکریہ ، لیکن

غنیچہ - ناشگفتن با برگ عافیت معلوم !

میں آپ کے احکام کی تعمیل فرض جانتا ہوں ، لیکن سوال یہ ہے کہ زندگی کے اور فرائض مجھ سے کب ادا ہوتے ہیں کہ یہ ادا ہو سکے گا

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میری ”طبع اندوگین“ نے بہت سے احباب مجھ سے جدا کر دئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ میرا یہ جواب آپ کو بھی مجھ سے متنفر کر دے۔ آپ کی محبت کی جو عظمت میرے دل میں ہے ، اس کا اقتضاء تو یہ تھا کہ بغیر کسی پس و پیش کے آپ کے فرمان کے سامنے سر اطاعت خم کر دیتا ، لیکن اس کا کیا علاج کہ مجھے اپنی ذات سے دشمنی بھی تو ہے اور وہ شاید آپ کی محبت سے زیادہ دیرینہ سال ہے۔ پھر وہ شخص جس نے خود کشی پر کمر باندھ لی ہو اس کی جان آپ کہاں تک بچائیں گے

در بغل دشمن نہاں ساختہ غالب امروزی

گزارید نہیں ، بلکہ ————— بگزارید کہ ماتمزدہ تنہا ماند !

معاف فرمائیے ، آپ جس زاویہ سے دنیا کا مطالعہ کر رہے ہیں ، وہ میرے زاویہ نگاہ سے بہت مختلف ہے آپ کا زاویہ حادثہ ہے یا منفرد ، یا ————— اور میرا مستقیم ————— یعنی یا تو آپ تفريط سے کام لیکر نشار کی انتہا کر دیں گے یا افراط کو مد نظر رکھ کر حقیقت سے بھی روگردانی کر لیں گے لیکن میرے یہاں تو وہی ایک ۹۰ ڈگری والی نگاہ ہے۔ یعنی پہلے ایک رائے قائم کرنا اور پھر اسی کو سامنے رکھ کر سیدھا راستہ اختیار کر لینا ، خواہ وہ ترکستان جاتا ہو یا عربستان ! بالکل اسی قسم کا اختلاف میرے آپ کے درمیان اس معاملہ خاص میں بھی ہے۔ آپ چچان بین کی اس منزل پر ہیں جہاں ”سوائے“ ”کرکرا“ کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا ، میں فطرت انسانی کی لغزشوں کے لئے بھی تھوڑی سی جگہ سادہ چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ البتہ اگر آپ کی رائے میں وہ اصلاح کی حد

سے گزر گئے ہیں (جس سے میں متفق نہیں) تو بیشک مجبوری ہے، اور اس صورت میں مجھ سے کیا، سقراط و افلاطون سے بھی رائے لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک بار پھر یہی عرض کروں گا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار اور غور کر لیجئے اور یہ سمجھ کر کہ انسان کی تمام تمنائیں پوری نہیں ہوا کرتیں اور پوری ہو بھی جائیں تو کوئی لطف نہیں !

کیا خوب ! آپ کے خط کا جواب دینے میں مجھ سے ایک دن کی تاخیر ہو جائے تو میں نامعقول و بدتمیز، لیکن آپ میرے خط کا جواب کبھی نہ دیں تو آپ بدستور معقول و خوش تمیز بنے رہیں۔ کیا جو پور میں اسی قسم کی منطق پڑھائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہاں کے قاضی اسی قسم کے استدلال سے مشہور ہوئے تھے !

میں جانتا ہوں کہ آپ کا خط، کوئی تفریحی چیز تھی کہ میں اسے شمس کر ڈالتا، بلکہ کاروبار سے متعلق خط، آپ کی زندگی کی اس منزل سے تعلق رکھتا تھا، جس میں پیچھے مڑ کر دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کی تحقیق کے لئے مجھے کچھ وقت تو ملنا چاہئے تھا۔

خیر، یہ تو جواب تھا آپ کی خفگی کا، اب اصل معاملہ کے متعلق بھی سن لیجئے۔ اول تو اُن سے کسی دن تک ملاقات نہ ہو سکی، باہر کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ کل واپس آئے تو گشتگو ہوئی۔ پہلے تو انھوں نے آپ کی پیشکش کو قابل توجہ ہی نہ سمجھا، لیکن جب میں نے تمام اعداد و شمار دکھائے تو انھوں نے ہر مشکل وعدہ کیا کہ وہ خود جا کر دیکھیں گے۔ اسلئے اب آپ ان کی آمد کا انتظار کیجئے۔ تاریخ کی تعیین انھوں نے ابھی تک نہیں کی ہے، لیکن میں اُن سے پوچھ کر آپ کو مطلع کروں گا۔ جلدی نہ کیجئے ورنہ وہ بھڑک جائیں گے، نہایت سخت قسم کے ”گرگ باران دیدہ“ انسان ہیں۔

یہ آپ نے کیا کہا کہ کل کی خبر نہیں کیا ہوگا۔ آپ کو خبر نہ ہو، مجھے تو ہے۔ صبح سورج نکلے گا اور شام کو ڈوب جائیگا۔ اسی کا نام کل تھا، اسی کا نام آج ہے اور اسی کو فردا کہیں گے ! آپ کا ریشمی گدول پر سونا، میرا پوریہ پر کروٹیں ملنا ان دونوں میں کوئی چیز اس نظام کو بدل نہیں سکتی، جو آفتاب صبح کو طلوع ہوا ہے وہ شام کو غروب ضرور ہوگا اور دن کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گا۔

آپ دنیا کو اپنے نقطہ نظر سے کیوں دیکھتے ہیں۔ آپ اس کی پوری کردی حیثیت کو سامنے رکھتے، جب تک ہم زندہ ہیں اس کے ساتھ گردش کرتے رہیں گے، ہمارے بعد جو آئیں گے وہ اسی چکر میں رہیں گے۔ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ ”بیم ورجا“ کی زندگی میں جو تعطل پیدا ہو جاتا ہے، وہ مجھے پسند نہیں۔ عمل محض عمل کے لحاظ سے خود اپنی جائیداد کی کابھوت ہے۔ یعنی اگر دم آنکھوں میں ہو تو بھی ”ساغر و مینا“ کو سامنے رہنا چاہئے۔ یہ تو آپ کی پہلی بات کا جواب ہوا اب دوسری بات لیجئے۔ آپ نے مسلم لیگ کی جس بڑی ہستی کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق میں صرف یہ کہوں گا کہ جو کچھ وہ

کہتا ہے اسے نہ سنئے، بلکہ جو کچھ وہ کرتا ہے اسے دیکھئے۔ زبان پر نعرہ آزادی اور ہاتھ میں برطانوی دامن لب پر ذکر پاک یزداں اور دل میں اہرن !

پھر جناب یہ شراب تو ہے نہیں کہ ”یا غفور“ کہہ کر آپ چڑھا جائیں اور کام چل جائے۔ یہ معاملہ دارورسن کا ہے جہاں ”انا الحق“ کہے بغیر کچھ بات نہیں آسکتا۔

محمدؐ نے آزادی کا تحفہ بویا علیؑ نے اسے پروان چڑھایا لیکن آج محمد علیؑ (جینا) کے نزدیک اس کی حیثیت ”سمقند و بخارا“ سے بھی کم ہے کہ بجائے ”خال ہندو“ کے ”زلزلہ چلیپا“ پر قربان کر دینے کے لئے طیارہ ہے !۔ پھر قیامت یہ ہے کہ اس واقعہ کو تاریخ اسلام میں بھی شامل کیا جائے گا اور ان بردہ فروشوں پر آپ کی اولاد فخر بھی کرے گی ! معاذ اللہ !

کیا پوچھتے ہو ان کا کیا عالم ہے

رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اڑتا جائے ہے !

آپ کا پیام شکر نہیں پڑے، لیکن ایک ایسی سوگوار سنہی کے ساتھ کہ اس سے زیادہ رونا ممکن نہیں ! میں نے زیادہ گفتگو مناسب نہیں سمجھی، لیکن سنا میں نے بھی یہی ہے کہ تعلقات کی نزاکت نے زیادہ خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ صورت - ”دل گرفتار و یار بے پروا“ کی تو نہیں ہے، تاہم - ”دیر سے ست کہ خاطرش بیا نیست“ ابھی دیکھتے جائیے کیا ہوتا ہے۔

خدا کے لئے کبھی تو کوئی غلطی کیا کرو۔ آخر انسان ہو خدا تو نہیں ہو۔ پھر اس ہوشیاری و چالاکی کے کیا معنی ! سچ کہتا ہوں، بعض وقت یہ سوچ کر میرا دم گھٹنے لگتا ہے کہ میں تم کو کوئی مشورہ دے سکتا ہوں، نہ تم کسی کی مان سکتے ہو آئینہ میں ذرا اپنی صورت تو دیکھو، کیسی ”روڑھی“ ہوتی جاتی ہے۔ حاققوں کے ”بھولے پن“ کا کوسوں پتہ نہیں ہر وقت تمہارے چہرہ سے ایک ایسے خطرہ کا سا احساس پیدا ہوتا رہتا ہے جیسے دشمن کے ہوائی جہاز بم برسائے ہی والے ہوں۔ لاجول ولاقوۃ ! یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے کہ انسان نہ کسی کے دھوکے میں آئے، نہ کوئی اسے بیوقوف بناسکے۔

بولو، کب آؤ گے۔ واقعی مجھے تمہاری ضرورت ہے، میں جھوٹ نہیں بولتا اور بولوں بھی تو کس توقع پر ؟

جناب من - جو شعر آپ نے لکھا ہے وہ غالب کا نہیں ہے، لیکن اگر آپ کو اسی پر اصرار ہے، تو غالب ہی کا
 سہی۔ بہر حال جس کا بھی ہو، بالکل لغو و مہمل ہے۔ آپ نے اس سے زیادہ کچھ پوچھا نہیں، اس لئے تفصیل میں
 کیوں پڑوں اور آپ پوچھیں بھی تو میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہوں گا کہ مہمل ہے اور بلا دلیل مہمل ہے۔
 خدا کے لئے کوئی اور مشغلہ اختیار کیجئے، یہ بالکل ذوق کی چیز ہے اور آپ منطق سے کام لیتے ہیں۔ عاقبت
 خراب ہونے کا تو اندیشہ نہیں، لیکن دماغ خراب ہو جانے کا ضرور ہے۔

آپ کے فائدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علیحدہ علیحدہ خرید فرمائیں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ ہریں:

نگارستان	جمالستان	ترغیبات حسنی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ
معرکہ مخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
دھائی روپیہ	دھائی روپیہ	دو روپیہ	دھڑ روپیہ	تائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں بلجائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

پیشبر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

سوق الکساد — علیٰ ہذا القیاس

(مولانا ابوالکمال امید امیٹھوی)

مُشتری کو، جوہری کو اندریں سوق الکساد

ہست بھی وصل کر در شاہوارم کردہ اند

۱۔ شعر مندرجہ عنوان میں ”سوق الکساد“ کی ترکیب ایک معترض کے نزدیک محل نظر اور غلط ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ صفت موصوف میں مطابقت ہونا چاہئے اور یہاں نہیں ہے، یعنی اسے ”السوق الکساد“ ہونا چاہئے۔ الف لام سوق پر بھی داخل ہونا چاہئے۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں صفت و موصوف کی ترکیب ہی نہیں ہے، بلکہ ترکیب اضافی ہے، سوق مضاف، کساد مضاف الیہ۔

۲۔ یہی علامہ عصر ”علیٰ ہذا القیاس“ کے املا کو بھی صحیح جانتا ہے اور دوسرے الف کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صحیح ”علیٰ ہذا القیاس“ ہے۔

براہ نوازش استفسارات کے سلسلہ میں جواب تحریر فرمائیے اور مثالیں مع دلیل بیان فرمائیے، تاکہ طرفین مستفید ہو سکیں۔
مکن تھا کہ میں زبانی آپ سے اس مسئلہ کو حل کر لیتا لیکن اس صورت میں معترض مطمئن نہ ہوتا۔

(نگار) ”سوق الکساد“ صفت و موصوف کی ترکیب ہی نہیں ہے بلکہ کھلی ہوئی ترکیب اضافی ہے۔ اگر یہ ترکیب توصیفی ہوتی تو ”سوق کاسد“ یا ”السوق الکاسد“ ہوتی۔ یہاں تو کساد بھی اسم ہے اور سوق بھی اسم۔

ہر چند شعراء فارسی نے "کساد" کو کبھی کبھی "کاسد" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً ظہوری کہتا ہے:

شوقت نبرد بہ کار مالدست
بازار رفوگراں کساد دست

لیکن یہ حالت ترکیب کساد، کاسد کے معنی میں کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔

عربی میں صفت و موصوف کے ساتھ الف لام کے استعمال کا قاعدہ یہ ہے کہ یا تو دونوں پر الف لام ہوگا جیسے
رایت المرأة الحسار (میں نے ایک خوبصورت عورت دیکھی) یا کسی پر نہیں جیسے "جاو فی رُجُل قبیح" میرے پاس ایک
بد صورت مرد آیا۔

ترکیب اضافی میں مضاف پر کبھی الف لام داخل نہ ہوگا اور مضاف الیہ معرف بہ لام بھی ہو سکتا ہے، جیسے:
"حمرۃ العین" (آنکھ کی سُرخی) اور فرس زید (زید کا گھوڑا) لیکن فارسی والے اس کی بھی زیادہ پرواہ نہیں کرتے
مثلاً خاقانی کا شعر ہے:

دنیاست کمینہ چاکرانش، در دارالحکم داوراننش،
یا ایک اور شاعر کہتا ہے:

منت خدائے را کہ علی الرغم روزگار منصور گشت رایت خان بزرگوار

پہلے شعر میں حکم اور دوسرے شعر میں رغم مضاف ہے، لیکن الف لام دونوں پر داخل ہے۔ بات یہ ہے کہ
ان دونوں شعروں میں پورے کلمہ مرکب کو کلمہ واحد خیال کر لیا گیا ہے، یعنی "دارالحکم" اور "علی الرغم" دونوں کو
ایک کلمہ یا لفظ خیال کر کے مضاف بنایا گیا ہے اور اس لئے مضاف پر الف لام داخل کرنے کا اعتراض دفع ہو گیا۔
گو اس کا تعلق مثلاً زیر بحث سے نہیں لیکن میں نے اس کا اظہار اس لئے کر دیا کہ آپ کا معترض الف لام کے
باب میں بہت زیادہ سخت گیر معلوم ہوتا ہے، مبادا وہ فارسی کی اس قسم کی ترکیبوں پر بھی آئندہ اعتراض کی
جرات کرے۔

الغرض "سوق الکساد" کی ترکیب بالکل صحیح ہے اور معترض نے یا تو غلطی سے کساد کے معنی کا سد سمجھ کر
اس کو صفت و موصوف قرار دیا یا سرے سے وہ اس ترکیب کو سمجھے ہی نہیں۔

"سوق الکساد" کی ترکیب بالکل ایسی ہی ہے جیسے "ناراحب" (محبت کی آگ) اور اگر یہ صحیح ہے تو اسے
بھی صحیح ہونا چاہئے۔ چند مثالیں عربی شعراء کے کلام سے ملاحظہ ہوں:

صلاح الدین لکھتا ہے:

کیفیک من ہولہ ان لست تبلغ
الا اذا ذقت طعم الموت فی السفر

رفیامت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تو اس کے ہول کا خیال بھی نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ تو سفر میں موت کا مزہ چکھے

اسی کا ایک شعر اور ہے:

واذا رایت بنیک فاعلم انہم
(جب تو اپنی اولاد کو دیکھے تو جان لے کہ انہوں نے موت کا راستہ تیری طرف بنا دیا ہے)

ابن ملح لکھتا ہے:

طویت سماء المکرما ت دکورت شمس المدیح
(انعام و اکرام کے آسمان لپیٹ دئے گئے اور مدح و ثناء کا آفتاب تاریک ہو گیا)

ایک اور شاعر السجاوی کا شعر ہے:

ومن العجائب انی فی لج بحرا لجود راکب
(عجیب بات دیکھو کہ میں دریائے جود و کرم پہ چلا جا رہا ہوں)

ابو المنظر مجد الدین کا شعر ہے:

لم القہ مذاضا منا فحین بد ا ، لنا ظری افترقنا فرقة الابد ،
(جب تک ہم وہ ساتھ ساتھ رہے کبھی میں نے اسے نہ دیکھا لیکن جب میری آنکھوں کے سامنے آیا تو ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے)

ان اشعار میں طعم الموت (موت کا مزہ) مسافة الآجال (موت کا راستہ) - سماء المکرما ت (انعام و اکرام کا آسمان) اور بحر الجود (عطا و بخشش کا سمندر) - فرقة الابد (ہمیشہ کی جدائی) یہ سب ترکیبیں سوق الکساد کی قسم کی ہیں اور عربی میں بہ کثرت مستعمل ہیں۔

۲۔ علیٰ ہذا القیاس کا صحیح املاء وہی ہے جو آپ بتاتے ہیں، یقیناً درمیان میں دو الف ہونا چاہئے۔ آپ اپنے دوست سے پوچھئے کہ اگر بجائے ہذا کے ”ہذہ“ ہو تو کیا وہ ہذا کی طرح ہذہ کی (لا) کو بھی اڑا دیں گے اور اسے بھی علیٰ ہذا القیاس لکھیں گے۔

الغرض آپ کا معترض دونوں باتوں میں غلطی پر ہے۔ انشاء بھی غلط، املاء بھی غلط !

تاریخ اسلامی ہند مع توثیق

کتابی شکل میں

منیجر نگار لکھنؤ

نگار سائز کے ۲۴۲ صفحات پر - قیمت مع محصول ۱۱۰/-

کلام ماہر لکھنوی

(مسل)

تصوف - ماہر کے کلام میں متصوفانہ اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

حسن قدرت کا تری ہو جلوہ گر تن میں مرے	ہوں ترا عاشق جو اپنا آپہری دیوانہ ہوں
جو آئینہ ہے وہ ترا صورت نما نہیں	یکتا وہ تو ہے جس کا کہیں دوسرا نہیں،
مدام تشنہ عرفان کر دگار رہا	وہ مست ہوں کہ جو غفلت میں ہوشیار رہا
کیوں نہ فرقت میں بھی اب لطف ملیں صلت کے	دل وہ پہلو میں ہے جس میں ہو محبت تیری
کس کس حجاب میں نظر آیا جمال دوست	کیا حسن ہے حجاب میں دیدار عام ہے
کس طرح کہدوں یہ میں عشاق وحدت بائے	تجھے کوئی صدا بھی تو تری آواز سے
دیکھیں بشر جو چشم بصیرت سے اک ذرا	ہر گ دکھائے معرفت حق کی راہ کو
رنگ صانع کا ہر اک گل سے نمایاں دیکھا	سبزہ باغ کو خضر رہ عرفاں دیکھا
باغ سے صنعت صانع کو نمایاں دیکھا	ہر گ گل کو رہ منزل عرفاں دیکھا
جو دیکھتے ہیں تامل سے ہر گ تن کو	وہ راہ معرفت کر دگار سمجھے ہیں
نہاں وہ نظروں سے سمجھے ہر جگہ کہ بنیا ہیں	وہ کو رہیں جو تجھے آشکار سمجھے ہیں
ہے تعدد بھی بتوں کا اُسکی وحدت کی دلیل	کب خدائی کا سماں دیر برہمن میں نہیں

مذہبی عقیدت - ماہر نے اکثر اشعار میں اپنی مذہبی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

مرسلوں میں بھی دم حشر یہ غل ہے تر عرش	سب بیٹیں امت محبوب خدا آتی ہے
نبی نہ کیوں خم ہوں مثل خام اٹھائے ہیں سر پہ بارِ عالم	نہ کیوں تو اضع سے ہوں کرم نشان ہو پشت پر کیں کا
میں نے کسے نسخہ اکسیر کیا کروں ماہر	جہاں میں خاک در بو تراب باقی ہے
ماہر کو قبر بیستی ہے یا ابو تراب	جلد آئے فساد ہوا استخوان جلے

بنے ہیں دیدہ ہائے منتظر نقش قدم ماہر زمین بھی ہے یہ شایق مہدی بادی کے مقدم کی
وسعت تحمیل۔ یہی وہ انفرادی رنگ ہے جس کا نمایاں طور پر ماہر کے کلام میں مظاہرہ ہوتا ہے۔ انھوں نے دنیا
 کی مختلف اور متنوع اشیاء پر مختلف طرح سے نظر کی ہے اور اُس کے جداگانہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اُس سے
 بقلہوں نتائج پیدا کئے ہیں۔

یوں تو بہت سے شعراء کے کلام میں جستہ جستہ اس طرح کا نمونہ ملتا ہے لیکن جس وسعت اور تجزیہ و تنوع کے ساتھ
 ماہر نے ہر شے کو دیکھا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔
 پہلو جن پر وہ نظر ڈالتے ہیں اُن کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اخلاقی، فلسفی، نفسیاتی اور بعض بالکل شاعرانہ
 اور اسی میں تشبیہات کا ایک خزانہ ہے جو بڑی فیاضی کے ساتھ صرف کیا گیا ہے۔ میں اُن اشیاء کو حروفِ تہجی کی ترتیب
 سے درج کروں گا اور اُن میں سے ہر ہر پہلو کے متعلقہ اشعار کو الگ الگ پیش کروں گا۔

(۱) آبلہ: مثال آبلہ ادنیٰ کے دکھ سے دکھ ہے مجھے دے جو پاؤں سے کانٹا کٹشک سی سر میں ہے

کہتا ہوں یہ تپک پہ ہر اک آبلہ کی میں دل کتنے دیگا اب مرے پروردگارِ دل

عجب نہیں اس اشارے سے وہ چلے آئیں تپک تپک کے بلاتا ہے آبلہ دل کا

خار ہائے دشت سے کہد و کہیں گے کب خبر آبلے بھی بیٹھے جاتے ہیں مرے دل کی طرح

دشتِ وحشت نے بٹایا درد جب میرا کبھی آبلے پا کے، بنے چھالے زبانِ خار میں

وحشی خجل ہیں پاؤں جو گھر سے نکال کے شیشے ہیں آبلے عرقِ انفعال کے

(۲) آسیا: نہ جاصدائے فقیران آسیا خو پر یہ جتنا سیر ہوں اتنا سوال کرتے ہیں

مستحقِ جان نہ تو سائل سرگرداں کو آسیا کا جو بھرے پیٹ تو چکر میں رہے

میں سخت جاں رقیب سوا آسیا سے کیا کوئی مرض نہیں ہے تو دورانِ سر تو ہو،

(۳) اشیاں: نظر گلچیں کی کیوں پڑتی اجڑتا کیوں مکان میرا چھپا لیتے جو برگِ نخل ملکر آشیاں میرا

وہیں سب ہزباں ہیں، ہو رہا ہے کچھ بیاں میرا چمن میں جس طرتِ اجڑا پڑا ہے آشیاں میرا

ہوا پر دیکھ کر تنکے، قفس میں میں یہ کہتا ہوں کدھر ہو باغِ والو، لٹ رہا ہے آشیاں میرا

قفس میں میں ہوں دل بھولوں بھری شاخیں گلستاں عوض میرے لگاتی ہیں گلے سے آشیاں میرا

صیاد کچھ تو اہل قفس کا نشان رہے ہم ہوں نہ ہوں، چمن میں ملکر آشیاں رہے

اُسی کو ہوش میں دیکھا اجڑتے آنکھوں سے جہاں میں تنکے چنے تھے جس آشیاں کے لئے

(۴) آفتاب: طلسم تھا کہ شعاعوں میں آفتاب آیا ہزار ہاتھ پہ اک ساغر شراب آیا

کیوں شفق گول ہونہ رنگ حسن باغ آفتاب
ہیں شمعائیں یا ٹیکا ہوں میں پئے جاتی ہو صبح
دیدے اپنے دست نازک کچھ بھی کوئے شعاع
خورشید کی طرح ہمہ تن میں جو داغ ہوں
وہ جو خواب ز ہیں، نکلا ہے آفتاب
سائے میں میرے خلق کو مشکل قیام ہے
دکھلا رہا ہے آئینہ گردوں سحر نہیں

یہاں عربی کا یہ مصرع یاد کر لیجئے :- والشمس کا طر آة فی کف الاشمل

(۵) آئینہ: جو ہر سے آئینوں کا کلیجہ فگار ہے
ان رے جذب دل اتر آئی بشیہ رو دست
آئینہ سانسے رکھ کر بھی کھلا کچھ نہ بکھینے،
آئینہ لیکے ہاتھ میں غیروں پہ طعن ہے
صاف کر قلب تو ہو ضیق میں وسعت تجھ کو
آئینہ لیکے بھی بڑھتی نہیں حیرت تیری
اُن کو جب ہوتی ہے منظور نظر خود بینی
(۶) اسپند: مثل اسپند بھی دی دل نے نہ آواز مجھے
ایک نالہ نے فنا مجھ کو کیا مثل اسپند
مرد غیروں کے لئے دل کو جلا دیتے ہیں
(۷) اشک: اشکوں سے کچھ سکون ہے مجھ پر گناہ کو
کس طرح رونے میں لے ماہر میں کھوں روئے دست
کشتہ ہوئی ہے کوئی تو ایسی ہی آرزو
کاندھا بدلتے آتے ہیں آنسو بھی سوئے چشم
بیجاں کریں گے عشق میں اشک رواں بجے
اشک ہر ایک مثال در غلطیاں نکلا،
آہ دل سے جوش اشک چشم حیراں ہو گیا
مرے دامن کو نگین اشک خوں سودت ہو دیں
امنڈ آئے ہیں میری آنکھوں میں آنسو
صاف اسپند یہ آتش پہ صدا دیتے ہیں
تھا تھا ہے لنگروں نے جہاز تباہ کو
آنسوؤں کے تار اچھے ہیں نگہ کے تار میں
آنسو تڑپتے آتے ہیں چشم پر آب میں
جاتی ہے لاش قبر میں، سخت جگر نہیں،
لوٹیکا رہزنوں کی طرح کارواں مجھے
دل کے ویرانہ سے گنجینہ پنہاں نکلا
لوہو اسے آب آئینہ میں طوفاں ہو گیا
محبت میں لٹیکا میرے ہاتھوں کارواں میرا
حبابوں سے دریا بہا چاہتے ہیں،

پتھر میں کس نظر کا نشان آشکار ہے
میری نظروں سے جو آئینہ نے دیکھا سو دست
اپنے گھر میں رہے یا غیر کے تم گھر میں رہے
خود گھر پڑے جو حسن پہ اُس کی خبر نہیں
ایک آئینہ میں سو مردم محفل ٹھہرے
دیکھ تو دیکھ رہی ہے تجھے صورت تیری،
میری حیرت انھیں آئینہ دکھا آتی ہے
ایسے جلنے پہ اور اس ضبط پہ ہر ناز مجھے
ڈھونڈھتی کیوں نہ نکلمر مری آواز مجھے
صاف اسپند یہ آتش پہ صدا دیتے ہیں
تھا تھا ہے لنگروں نے جہاز تباہ کو
آنسوؤں کے تار اچھے ہیں نگہ کے تار میں
آنسو تڑپتے آتے ہیں چشم پر آب میں
جاتی ہے لاش قبر میں، سخت جگر نہیں،
لوٹیکا رہزنوں کی طرح کارواں مجھے
دل کے ویرانہ سے گنجینہ پنہاں نکلا
لوہو اسے آب آئینہ میں طوفاں ہو گیا
محبت میں لٹیکا میرے ہاتھوں کارواں میرا
حبابوں سے دریا بہا چاہتے ہیں،

- (۸) اگر: ڈھل آئے ہیں آنکھوں سے مرگاں پہ آنسو
جہازوں کے لنگر بڑا چاہتے ہیں
وہی نکلے ہیں بنکر اشک ہائے سرمہ آلود
بھرے تھے کوکرموتی جو انکی خیم جادو میں
تری مرگاں نے کچھ ڈھلکا کے اشک سرمہ آلود
لگایا قفل بھی طرف طلسم خیم جادو میں
جیسے جلتا ہے اگر پردہ خاکستریں
چپکے چپکے یوہیں حلجاتے ہیں جلنے والے
وہ سلامت رہیں یا رب کہ اگر کی صورت
دفن جو مجھ کو مری خاک میں کر دیتے ہیں،
(۹) برق: اب میں برق کی یہ جلوہ گری کہتی ہے
کوئی بے چین ہے پردہ سے نکلنے کے لئے
(۱۰) بگولہ: کیا ہوا سنا یہ فیروں کی جو تربت پر نہیں،
سہ بگولہ گنبد گور غریباں ہو گیا
دھوپ میں دشت نور دی کو جو نکلے وحشی
کھو لکر چتر بگولے سر منزل ٹھہرے
مجھ سے وحشی کا جنازہ جو اٹھا صحرا میں
گاندھا دینے کو بگولے سر منزل ٹھہرے
بگولے پیچھے ہیں سر کو کھولے
جنازہ آگے ہے نجد حزیں کا،
(۱۱) یو: چمن دہر میں جمعیت خاطر ہے کسے
بوئے گل کو بھی جو دیکھا تو پریشاں دیکھا
برنگ بوہوں نہ پوچھو مرے سفر کا حال
ہوا جدھر کی چلی اُس طرف روانہ ہوا
طایر بو کی طرح غیر سے بازو ہیں قومی،
جنش موج ہوا ہے پر پر داز مجھے
زور بازو نے کیا تھا بوئے غنچہ جب مجھے
سو قفس تھے پر نہ اک بھی مانع پرواز تھا
(۱۲) پرکار: جامع مقام و کوچ کا پرکار دار ہوں
اک پاؤں ہے حضر میں مرا اک سفر میں ہے
(۱۳) پیری: بڑھاپا آتے ہی بیگانہ سہ بیگانہ ہوا
بڑھاپا آتے ہی بیگانہ سہ بیگانہ ہوا
فصل پیری میں کیوں نہ ہو دھڑکن
دل میں یہ ماتم جوانی ہے،
تصویر انقلاب زمانہ ہوں شیب میں
پاؤں میں ہے سکون حرکت جیسے سر میں ہے
تاثر ضعف عالم پیری کو دیکھتے
سایہ بھی بے عصا نہ چلا ہم جہاں چلے
تکلیف عدم جانے کی جب کرتی ہے پیری،
کس عجز سے کرتا ہوں نہیں سر کو ہلانے
پیری میں روؤں کو نئے عضو بدن کو میں
دل مرچکا ہے آنکھ کا لبریز جام ہے
شب شباب کٹی خوف روز پیری میں
تمام رات ہم اندیشہ سحر میں رہے
عشرت ہو ذکر اب کسی جس کا کہ پیری آئی شباب گزرا
عروق پیری میں جو عیاں ہر انھیں میں دنیا کے ہم نہاں میں
کھانا ہاتھوں کی چھریاں میں ہزار میں اک استی ہے
سب چل بسیں گی دل سے بڑھاپے میں حشر میں
نکلیگا قافلہ بھی سراسر سے سحر تو ہو،

(۱۴) تسبیح: حال رشتہ کا سر تسبیح سے آخر کھلا کیوں نہ آتا کہ زباں پر سودلوں میں راز تھا

کہتے ہیں پھر کے دانہ تسبیح وقت ذکر کچھ ہو نہ نکلے ہاتھ سے دل انقلاب میں

مگر میں تسبیح کا ہوں دانہ جو اسکو کھونا تو اسکو پانا ہزار پھرتا ہر زمانہ فراق دیکھا نہ ہمنشیں کا

صورت دانہ تسبیح رہے گردش میں گو سفر ہم نے کیا پر نہ وطن سے نکلے

صفت دانہ تسبیح ہوں، کیونکر ہو سکون چین اُس ہاتھ سے پاؤں تو مراد دل ٹھہرے

(۱۵) تصویر: کوئی خود دار مصور سے کھنچا بیٹھا ہے اب نہ کاغذ پہ گرے عکس تو کچھ دور نہیں

انکی تصویر کا کیوں رنگ نہ رہ رہ کے اڑے نچلے بیٹھیں کہیں بے چین یہ دستو نہیں،

ضعف سے ہوں ہمہ تن صورت تصویر ضعیف رنگ کے ساتھ خود اڑ جاؤں تو کچھ دور نہیں،

جن کی تصویر مرے پاس ہے کہد و اُن سے آپ ہی اپنے سے تم دور ہو، ہم دور نہیں

تصویر کھنچ رہی ہے، نزاکت میں مست ہیں کھنچ کر چلے کہاں سے کہاں کچھ خبر نہیں

ملگے ہیں آج بے قابو جو وہ تقدیر سے رنگ کیا کیا کر رہا ہے شوخیاں تصویر سے

خود بھی تصویر بنے ہو، یہ تماشا کیا ہے منہ اترتا ہی چلا جاتا ہے، نقشہ کیا ہے

مرغ تصویر ہوں، پونچھو نہ مری حسرت کو پر تو ہیں بھی مگر آتی نہیں پرواز مجھے

(۱۶) تگرگ: واہ کیا خوب ہوا ختم سفر مشل تگرگ ہمیں باقی نہ رہے جب سر منزل ٹھہرے

(۱۷) جادو: خاکساروں کا سلوک اعجاز سے خالی نہیں بے چلے جادو رہا ہمراہی رہگیر میں

ہے کون مجھ غریب کی لے آ کے جو خبر پھیلانے پاؤں سوتے ہیں جا بے بھی راہ میں

سیراب آہوں سے نہ کس طرح میں کروں جادوے زبان خشک دکھاتے ہیں راہ میں

غربت ہماری ہے صفت جادو طریق، صحرا میں جا کے بھی قدم اپنا وطن میں ہے

کس نے تھک کر راہ کو دیکھا تھا چشم یاس سے صورت مدنگہ ہر جادو منزل میں ہے

(۱۸) چرمیں: عبت لب ہے نالاں جرمس راہ میں، کوئی قافلہ سے جدا ہو گیا،

(۱۹) جگنو: بعد مردن فصل باران کا یہ احساں ہو گیا، جگنوؤں سے قبر پر میری چراغاں ہو گیا،

ذرا سے سن میں وہ ترجیح کس کے حسن کو دیں فلک پہ نجم ہیں، جگنو ہیں اُن کے بستر پر

(۲۰) حباب: دیکھ مٹ جائے گام میں تو حبابوں کی طرح بحر عالم میں جو سر بھولے سے بھی اٹھ جائے گا

حباب آسا فلک کے دور میں مٹ کر یہ کہتا ہوں کسی کا ذکر کیا ملتا نہیں مجھ کو نشاں میرا

حباب بحر ہوں پونچھو نہ مجھ سے حال قسمت کا یہ گردش ہے کہ میرے ساتھ پھرتا ہے مکاں میرا

ہوائے منزوی خانہ حباب ہوں میں رہے گا گھر بھی نہ باقی جو میں روانہ ہوا
 بحر جہاں میں ہوں میں ہوائے تہ حباب گرمیں نہ ہوں تو گھر کا بھی میرے نشاں نہ ہو
 جب بلند اپنا ہوا نام و نشاں آپ سے آپ بنگیا مثل حبابوں کے مکاں آپ سے آپ
 جب کچھ کھلا نہ حال طلسمات دہر کا موجیں کلید بن گئیں قفل حباب میں
 یہ حباب آگے سر آب خبر دیتے ہیں دم جو لیتے ہیں زمانہ میں وہ سرد دیتے ہیں
 مسکن کسی کا مثل حباب رواں نہ ہو نکلے بدن سے سانس تو گھر کا نشاں نہ ہو
 رواروی کا جو غل تا بہ گوش آتا ہے حباب بحر میں خانہ بدوش آتا ہے
 آگے موجوں نے حبابوں کو طمانچہ مارا اُن کا انجام یہ ہے جنکے ہوا سر میں رہے
 دم بخود کیوں نہ رہوں دہر میں مانند حباب سانس لیتا ہوں تو دم تن سے فنا ہوتا ہے

ع-ن

(باقی)

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ :- از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ)
 یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے، جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲/-
 دیہی جنس :- دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید
 ہے۔ از جی۔ سی کمار پالتا صاحب۔ قیمت ۲/-
 ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :- از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے
 (جامعہ) اس مختصر سے پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور اُن کے قرضے
 وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴/-
 شہری آزادی :- اس کتاب میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور اُن کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و
 شمار سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو اُن کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے
 جن سے اُن کی زندگی داہستہ ہے۔ قیمت ۴/-
 منیجر نگار۔ لکھنؤ

تنوعات

روس میں کھپلی دفعہ سالانہ پریڈ کے وقت ہر سائیکل سوار کے ساتھ ایک کتا بھی پایا جاتا تھا۔ گویا جنگ کے دوسرے ضروری اسلحہ کے ساتھ کتے کارہنہ بھی ضروری ہے۔ اور وہاں اس کی اہمیت اتنی بڑی ہے کہ روس سے کوئی کتا باہر جا ہی نہیں سکتا جب تک وہ فوجی خدمت کے ناقابل نہ سمجھ لیا جائے۔

گزشتہ سو سال کے اندر چھ لڑائیوں کا ایک دوسرے سے ریاضی کا عجیب و غریب تعلق پایا جاتا ہے یعنی ہر کھپلی لڑائی کے ختم سال میں اس کے ہندسوں کو علیحدہ علیحدہ جمع کر دیجئے تو آئندہ لڑائی کے آغاز کا سال نکل آتا ہے۔ چینی کی لڑائی ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک جاری رہی۔ اب ۱۸۴۲ میں ۸۰، ۴۰، ۲ اور ۱ کے مجموعہ (۱۵) کو جوڑ دیجئے تو ۱۸۵۶ء ہو جائے گا، جب ہندوستان میں غدر ہوا۔ اب پھر دیکھئے کہ غدر ختم ہوا ۱۸۵۸ء میں۔ اس میں ۸، ۵، ۱ اور ۱ کے مجموعہ (۲۲) کو ۱۸۵۸ء میں جمع کیجئے تو ۱۸۸۰ء ہو جائے گا اور یہی سال مصر کی لڑائی کا تھا۔ مصر کی لڑائی ۱۸۸۱ء میں ختم ہوئی۔ اس میں ۸، ۱، ۸ اور ۱ کے مجموعہ (۱۸) کو جمع کیجئے تو ۱۸۹۹ء ہو گیا اور یہی سال جنوبی افریقہ کی لڑائی کا تھا۔ ۱۸۹۹ء سے انگریزوں کی سول و آرمی ہوئی بادشاہ قتل ہوا اور پہلی جمہوریت کراہول کی سیادت میں قائم ہوئی ۱۸۹۹ء میں یورپ انقلابی سرگرمیوں کا شکار رہا اور زبردست قحط پڑا۔ اب دیکھئے ۱۹۰۰ء سے کس مصیبت کا آغاز ہوتا ہے

اظہار محبت کے خطوط میں سب سے زیادہ طویل خط وہ ہے جو اس وقت برطانیہ کے عجائب خانہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ خط ملکہ الزبتھ کے ایک درباری نے اپنی محبوبہ کو لکھا تھا۔ یہ خط چار سو بار یک لکھے ہوئے صفحات کو محیط ہے اور موجودہ سائز کے تین تین سو صفحات کے چھ ناولوں کے برابر ہے۔ غالباً اس کی شادی اپنی محبوبہ سے نہیں ہوئی، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ تو باتوں ہی باتوں میں مار ڈالتا۔

امریکہ کا صدر لنکن بڑا حاضر جواب شخص تھا۔ ایک مرتبہ کسی ملک کا سفیر اس کے کمرہ میں ناگہاں داخل ہو گیا جہاں لنکن اپنا جوتا صاف کر رہا تھا۔

اس نے حیران ہو کر پوچھا ”کیا آپ اپنا جوتا صاف کر رہے ہیں“

لنکن نے جواب دیا ”ہاں، لیکن کیا آپ دوسروں کے جوتے صاف کیا کرتے ہیں؟“

ایک سائنس دان نے نظریہ پیش کیا ہے کہ گوشت کا استعمال گلے کے اعصاب اور رگوں کی نرمی کو ضائع

کر دیتا ہے اس لئے گوشت کھانے والے اچھے گانے والے نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر وہ انگریزوں کو پیش کرتا ہے جو بہت گوشت کھانے اور بہت خراب گانے والے ہیں بر خلاف اٹلی والوں کے جو گوشت بہت کم کھاتے ہیں اور عمدہ گانے والے ہیں۔

اس نے ثبوت میں اس حقیقت کو بھی پیش کیا ہے کہ گانے والی چڑیاں جتنی ہیں سب گھاس پات کھاتی ہیں، بر خلاف اس کے چیل، گدھ وغیرہ گوشت خوار طيور سب اس نعمت سے محروم ہیں۔

لڑکوں کی پیدائش جنگ کے وقت زیادہ ہوتی ہے یا اس کے بعد۔ پروفیسر مارسل تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمیشہ جنگ ختم ہونے کے بعد لڑکوں کی پیدائش زیادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ ۱۸۷۱ء کی لڑائی کے بعد جب ۱۸۹۱ء میں بیس سال کے نوجوانوں کی بھرتی شروع ہوئی ہے، تو ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انتخاب مشکل ہو گیا۔ اس کا سبب پروفیسر مذکور نے یہ بتایا ہے کہ مردوں کی زیادتی انحطاط کی علامت ہے۔ جنگ کے زمانہ میں بہترین قوار کے مرد لڑائی کے میدانوں میں چلے جاتے ہیں اور صرف بیمار و کمزور آدمی رہ جاتے ہیں، جن سے یہ حالت امن مشکل سے عورتیں شادی کرنے پر راضی ہو سکتی ہیں۔ لیکن جنگ کی وجہ سے انھیں مجبوراً انھیں چھٹے ہوئے مردوں سے عقد کرنا پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکے زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں جو مردوں کے انحطاط کی علامت ہے۔

الاما با میں عورتیں پاؤں میں کوئی زیور استعمال نہیں کر سکتیں۔

اتاہ میں جوتے کی ایڑی کی اونچائی ڈیڑھ انچ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

بوسٹن میں ہر گتے کی ٹانگ دس انچ سے کم ہونا چاہئے۔

سپسی میں بغیر جوتوں کا فیتہ باندھے کوئی شخص باہر نہیں نکل سکتا۔

نیویارک اسٹیٹ میں کوئی شخص گھوڑے کے پاس چھتری نہیں کھول سکتا۔

امریکہ کے کسی اخبار نے ایک ڈرامائی انداز کی نہایت مختصر کہانی لکھنے کی لوگوں کو دعوت دی اور سب سے بہتر کہانی پر انعام مقرر کیا۔ اس مقابلہ میں ہزاروں نے حصہ لیا اور انعام ذیل کی کہانی کو ملا:

الونیا کو اپنے بھائی کا ایک تار ملا جو اس کے شوہر کے ساتھ افریقہ کے جنگل میں شیر کے شکار کے لئے گیا تھا۔ تار کے الفاظ یہ تھے: باب شیر کا شکار کھیلتے ہوئے مارا گیا۔ الونیا بہت رنجیدہ ہوئی اور فوراً تار دیا کہ ”اُسے گھر

بھیجو“۔ تین ہفتہ کے بعد ایک بڑا بکس افریقہ سے پہونچا، جس کے اندر شیر تھا۔ الونیا نے پھر تار دیا کہ: ”شیر پہونچ گیا، تم سے غلطی ہوئی، باب کو بھیجو“۔ اس کا جواب آیا کہ: ”غلطی نہیں ہوئی“۔ باب شیر کے

اندر ہے۔

بجانب

نیاز فختوری کی دیگر تصانیف

نظامیہ اسلامیہ

فلاسفۂ قدیم اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں۔ ۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔ ۲۔ مادیوں کا مذہب۔ ۳۔ حرکت کے کرشمے۔ نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عمر) علاوہ محصول خریداران نگار سے چار آنہ (۴) کم	جذبات بھاشا جناب نیاز نے ایک دلچسپ تہیہ کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی بھلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔ قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲) خریداران نگار سے تین آنہ (۳) کم	محمد مصطفیٰؐ سار جوب کے سہ جلد ان تینوں جلدوں میں سلسلہ سے لیکر سلسلہ تک کے استفسار و جواب شائع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سائیکلو پیڈیا کی ہے۔ قیمت فی جلد تین روپیہ (۳) علاوہ محصول خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم	ترغیبات حبسی (۱) شہوانیات اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیاتے ہیں۔ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ نیز کہ مذاہب عالم نے اسے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ قیمت تین روپیہ (۳) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔
گہوارہ تمدن یہ وہ معرکہ الار کا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کے تہذیبی شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں اس موضوع پر اس قدر کتاب کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ قیمت دو روپیہ (۲) علاوہ محصول	مذاکرات نیاز یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دینا اخیسہ تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت بارہ آنہ (۱۲) علاوہ محصول خریداران نگار سے تین آنہ (۳) کم	فرست الید مولفہ نیاز فختوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی باقت کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (۱) علاوہ محصول خریداران نگار سے چار آنہ (۴) کم	شاعر کا انجام جناب نیاز کے عقوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ قیمت دس آنے (۱۰) علاوہ محصول خریداران نگار سے دو آنہ (۲) کم

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پیرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔
مینجر "نگار"

نگار سہ ماہی

تصانیف نیاز فحشوری

نگار سہ ماہی

نگارستان	جماستان	مکتوبات نیاز	شہاب کی سرگزشت
حضرت شہباز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے مقصد و مصمت میں غمیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔	ادبی نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۵ افسانے شامل ہیں۔ ایک درجہ جس میں زبان قدرت بیان کی تخیل اور پاکیزگی خیال۔ بہترین شاعرانہ کے علاوہ بہت سے چٹائی و جاشری میں کلامی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی بیشیہ رکھتا ہے۔ قیمت پانچ روپیہ (لکھنؤ) علاوہ محصول	ادبی نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگارسی اور سلاست بیان لکھنی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہے جس کے ساتھ خطوط غالب بھی پچھلے مضمون ہوتے ہیں معقول۔ حضرت نیاز ۲۵ پونڈ کے کاغذ پر چھپا شائع ہوئی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (لکھنؤ) علاوہ محصول	حضرت نیاز کا وہ عظیم النظم انسا جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی ہر شے ہی شگرت اور اس کی انشاء غالبیہ بحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (لکھنؤ) علاوہ محصول

اردو شاعری	ہندی شاعری
یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعرا پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے جسہ انتخاب کلام اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات مضامین ادبی نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔ حجم ۱۵ صفحات۔ قیمت ۵ روپیہ علاوہ محصول	یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔ اس میں تمام شہور ہندو شعرا کے کلام کا انتخاب ساتھ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو دو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت ۵ روپیہ علاوہ محصول